۱۶ فروری ۲۰۱۹ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۲ ۔ شمارہ نمبر: ۴

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱_۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے پر بھارت کے خدشات

(پہلا حصہ)

Darshana M. Baruah

ایشیا کو بہت وسیع انفرااسٹرکچر کی ضرورت ہے، یہاں علاقوں کو جوڑنے اور انفرااسٹرکچر کی ترقی کے لیے ممالک کے درمیان تعاون کے بہت وسیع مواقع موجود ہیں۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے اندازے کے مطابق خطے کے ترقی پذیر ممالک کو ہر برس انفرااسٹرکچر کی تعمیر پر خرچ کرنے کو ایک اعشاریہ سات کھرب ڈالر کی ضرورت ہے۔ یہ رقم ترقی کی رفتار برقرار رکھنے، غربت کے خاتمے اور ماحولیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے۔

جنگ عظیم دوئم کے بعد سے امریکا اور جاپان ایشیا میں ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کرنے والے اہم ترین ممالک ہیں، بہرحال اس حوالے سے دیگر ممالک خاص کر جرمنی اور برطانیہ نے بھی حالیہ عرصے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جاپان نے جنوبی ایشیائی ممالک خاص کر بھارت کی ترقی میں اہم ترین معاونت فراہم کی ہے۔ اس دوران چین خطے میں اہم تزویراتی اور معاشی کھلاڑی بن کر ابھرا اور اس نے ایشیا کو جوڑنے کا منصوبہ نئے سرے سے پیش کیا۔ بیجنگ نے خطے کو جوڑنے کے منصوبے کا آغاز کر کے نئی سیاسی سوچ کا مظاہرہ کیا، یہ چینی سرمائے سے بننے والا ایسا منصوبہ ہے جو بھارت کے گرد سیکورٹی ماحول کو تبدیل کر کے رکھ دے گا۔ بیجنگ کے بھارت کے پڑوسیوں سے بڑھتے تعلقات نئی دہلی کے لیے پریشان کن ہیں۔ ہر ابھرتی ہوئی عالمی طاقت کی طرح چین بھی اپنے پڑوس میں اپنی موجودگی بڑھانا چاہتا ہے۔ چین کے جنوبی ایشیا میں بڑھتے اثرات کے تناظر میں بھارت کو اپنے سب سے بڑے پڑوسی سے تعلقات مستحکم رکھنے اور خطے میں اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے چیلنج کا سامنا ہے۔

بھارت نے چین کی تجارتی کوششوں کو اپنے مفادات کے خلاف اور تزویراتی مقاصد کے لیے بیجنگ کی پیش قدمی کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا۔ بھارت کے سابق سیکرٹری خارجہ سبرامنیم جے شنکر نے ۲۰۱۶ء میں لکھا کہ ''تزویراتی مفادات اور تجارتی راہداریاں بنانے کے درمیان زبردست تعلق دنیا بھر میں موجود ہے اور یہی کچھ ہمارے براعظم میں نظر آ رہا ہے''۔ سبرامنیم نے تجارتی راہداریوں کو اپنے اثرات بڑھانے کے لیے استعمال کرنے والوں کے خلاف احتیاط سے بات کی ہے۔ تجزیہ نگاروں کے لیے چین کے بیلٹ روڈ منصوبے کو دوسرے ممالک اور ان کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے کے ہتھیار کے طور پر دیکھنا ایک عام بات بن گئی ہے۔ ۲۰۱۳ء میں اعلان کے بعد سے ہی ''بیلٹ اینڈ روڈ'' منصوبے نے کافی شہرت حاصل کی، اس منصوبے کے حوالے سے مثبت اور منفی دونوں باتیں کی گئیں۔ اس منصوبے کا شمار تجارتی راہداری اور انفرااسٹرکچر کی تعمیر کے لیے سرمائے کی فراہمی کے بڑے منصوبوں میں ہوتا ہے۔ اس منصوبے سے جنوبی ایشیا اور بحرہند میں چین اور بھارت کے درمیان مسابقت میں اضافہ ہو جائے گا۔ بھارت نے جوابی پالیسی کے طور پر بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے خلاف انتہائی سخت موقف اختیار کیا۔ اس نے مئی ۲۰۱۷ء میں چین کی میزبانی میں ہونے والے بیلٹ اینڈ روڈ فورم کا بائیکاٹ کر دیا۔ بھارت نے سرکاری اعلامیہ میں منصوبے کی شفافیت کے حوالے سے سوالات اٹھائے۔ نئی دہلی چین پاک اقتصادی راہداری کو اپنی خودمختاری کی خلاف ورزی قرار دے چکا ہے، بھارت نے بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ کو ایک منصوبہ سمجھنے کے بجائے اپنا ردعمل دے دیا۔ اس منصوبے کو مختلف دو طرفہ منصوبوں کی ماں سمجھنا زیادہ بہتر ہوگا، اس منصوبے میں بہت سے ایسے پراجیکٹس شامل ہیں، جن کا آغاز بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ بنگلا دیش، چین، بھارت اور میانمار تجارتی راہداریوں پر کام کا آغاز نوے کی دہائی میں کر چکے تھے، اسی طرح چین کا اکیسویں صدی کا ''میری ٹائم سلک روڈ پراجیکٹ'' بحر ہند میں دو طرفہ انفرااسٹرکچر کے منصوبوں کا حصہ ہے، اس کو چین نے کثیر ملکی منصوبہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

''بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے'' میں شامل جنوبی ایشیا سے گزرنے والی چار اہم تجارتی راہداریوں کا تجزیہ منصوبے کے حوالے سے بھارت کے خدشات سمجھنے میں مدد کرے گا۔ ان

اندرونی صفحات پر:۔

- امریکی انتظامیہ کی تختے اُلٹنے کی روش
- روزگار: تم جب جوان ہو گے، تمہیں شاید کوئی نوکری نہ ملے!
- چاہ بہار بندرگاہ بھارت کے لیے استحکام یا خطرہ؟
- سوشل میڈیا: ''تیز تر'' سے ''سست تر'' کی جانب
- ٹیکنالوجی کی ترقی سے ہوشیار رہیے۔۔۔
- شمالی افریقا میں اسلامی تحریکیں
- ترکی سعودی عرب تعلقات میں ایک نئی کشیدگی

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG No. SC-1303

میں سی پیک، بی سی آئی ایم، ہمالیہ کی راہ داری اور میری ٹائم سلک روڈ کے منصوبے شامل ہیں۔ یہ چاروں تجارتی راہداریاں اور ان کا انفرااسٹرکچر براہ راست بھارت کے تزویراتی مفادات سے جڑا ہے۔ یہ راہداریاں بھارت کی بحری اور بری سرحدوں کے قریب سے گزرتی ہیں اور اس کے سیکورٹی مفادات اور تزویراتی ماحول کو متاثر کرتی ہیں۔ بھارتی سرحدوں کے قریب موجود راہداریوں میں چین کی موجودگی خطے میں طاقت کا توازن تبدیل کرکے رکھ دے گی۔ بھارت کو خطے میں انفرااسٹرکچر کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن اسے چینی سرمایہ کاری کے تزویراتی اثرات پر شدید تحفظات ہیں۔ نئی دہلی کو بنیادی خدشہ ہے کہ بیجنگ معاشی اثرات کے ذریعے اپنے تزویراتی مفادات کو پورا کرے گا۔ اس کی اہم مثال سری لنکا کی تزویراتی مقام پر واقعہ بندرگاہ ہمبنٹوٹا ہے، چین نے ۲۰۱۷ء میں سری لنکا کی حکومت پر دباؤ ڈال کر ہمبنٹوٹا کو ۹۹ برس کی لیز پر حاصل کیا، بندرگاہ کو چین سے قرضہ حاصل کرکے تعمیر کیا گیا، لیکن انتہائی بلند شرح سود کی وجہ سے سری لنکا قرض کی ادائیگی میں ناکام رہا۔

بھارت کو اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر اپنے پڑوسی ممالک کے لیے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا متبادل پیش کرنا پڑے گا۔ ابھی تک بھارت نے خطے کو جوڑنے کے منصوبے کے لیے مشترکہ کوششیں کرنے میں کوئی تیزی نہیں دکھائی ہے، بہرحال بھارت نے منصوبے کا متبادل پیش کرنے کے لیے اپنا اہم ترین اتحادی جاپان کو بنایا ہے اور اس منصوبے پر تھوڑی بہت پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ جنوبی ایشیا اور بحر ہند میں اپنی برتری کو برقرار رکھنے اور اپنے تزویراتی مقاصد کے حصول کے لیے نئی دہلی کو فوری طور پر چینی منصوبے کا متبادل فریم ورک دینے کی ضرورت ہے۔ سال ۲۰۰۰ء میں چین نے اپنے مغربی علاقوں کی ترقی پر توجہ دینی شروع کی، اس وقت سے ہی بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا آغاز ہوگیا تھا۔ نوے کے دہائی میں چین کے ساحلی علاقے ترقی کر گئے تھے، جس کے بعد سے ساحلی علاقوں اور مغربی و دیگر علاقوں کے درمیان معاشی فرق بڑھتا جارہا تھا۔ انفرااسٹرکچر پر سرمایہ کاری اور ٹرانسپورٹ کی بنیادی سہولت کی فراہمی مغربی علاقوں کی ترقی میں اہم ترین عنصر تھا۔ جس کے فوری بعد بیجنگ نے اپنی سرحدوں سے باہر کے خطے کو چین سے جوڑنے کے لیے انفرااسٹرکچر تعمیر کرنے کے منصوبے بنائے۔ ان میں وسطی ایشیا کو زمین، سمندر، ریلوے اور بندرگاہوں کے ذریعے یورپ سے جوڑنے کے منصوبے شامل تھے، خطے کو جوڑنے میں بنیادی اہمیت بندرگاہوں کے منصوبوں کو حاصل تھی۔ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں متعدد ممالک کے درمیان جاری دوطرفہ منصوبوں کو یکجا کیا گیا، ''ون بیلٹ ون روڈ'' منصوبے کا باقاعدہ اعلان چینی صدر شی جن پنگ نے ۲۰۱۳ء میں کیا تھا۔ انہوں نے ستمبر ۲۰۱۳ء میں کرغزستان کے دورے کے دوران ''سلک روڈ اکنامک بیلٹ'' پر بات کی تھی۔ اس کے ایک ماہ بعد اکتوبر ۲۰۱۳ء میں چینی صدر نے انڈونیشیا کی پارلیمان سے خطاب میں میری ٹائم سلک روڈ بنانے کی پیشکش کی۔ مشترکہ تعاون کے ذریعے سلک روڈ بحالی کی چینی پیشکش کئی مقاصد رکھتی تھی۔ اس منصوبے کے دو حصے تھے، پہلا جنوبی اور وسطی ایشیا کے زمینی راستے کے ذریعے چین کو یورپ سے جوڑنا، دوسرا راستہ سمندری راہداری تھی، یعنی بحر ہند کے ذریعے چین کو یورپ سے جوڑنا۔ زمینی راستے کے حوالے سے بھارت ''سی پیک'' اور نیپال میں چینی سرمایہ کاری سے جاری منصوبوں پر شدید خدشات رکھتا ہے۔ جب کہ میری ٹائم سلک روڈ نئی دہلی کے لیے اس سے بڑا مسئلہ ہے، کیوں کہ بھارتی بحریہ کے لیے بہت اہم ہونے کے ساتھ بحر ہند بھارتی میری ٹائم سیکیورٹی اور تزویراتی مفادات کے لیے اہم ترین ہے۔ اگرچہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کی کامیابی کے حوالے سے صورتحال غیر یقینی کا شکار ہے، لیکن پھر بھی اس منصوبے کے خطے کے لیے معاشی فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کئی ایشیائی ممالک کے لیے چینی سرمایہ انفرااسٹرکچر کے بڑے منصوبوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اہم ہے۔ انفرااسٹرکچر کے منصوبے بنانے کی پیشکش کرکے چین نے خطے کے قائد کا کردار ادا کرنا شروع کردیا ہے۔ چین اپنی معاشی طاقت کے ذریعے خطے کی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ کسی متبادل منصوبے کی عدم موجودگی میں چینی پیشکش انفرااسٹرکچر کے ضرورت مند چھوٹے ممالک کے لیے پرکشش ثابت ہوگی۔ چین کے لیے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ زیادہ ملازمتیں پیدا کرنے اور خود کو جاپان اور امریکا کی طرح دوسروں کی ترقی پر خرچ کرنے والے ممالک کی فہرست میں شامل کرانے کے لیے اہم ہے۔ اس سے بیجنگ کو خود کو عوامی ضروریات پوری کرنے والا ملک دکھا کر اپنے لیے قائدانہ کردار حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

چینی وزیراعظم نے ۲۰۱۵ء میں پیپلز نیشنل کانگریس کے اجلاس میں اپنی سالانہ رپورٹ میں بیجنگ کے عالمی کردار کو واضح کیا، انہوں نے بتایا کہ چینی کمپنیاں بیرون ملک انفرااسٹرکچر کے منصوبے تعمیر کرنے کے ساتھ دیگر ممالک کی کمپنیوں کے ساتھ شرکت داری بھی قائم کررہی ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں چین نے اپنی توجہ پڑوسی ممالک کی طرف کرتے ہوئے پرامن ترقی پر زور دیا تھا۔ ۲۰۱۵ء میں چین نے عالمی سطح پر جارحانہ انداز میں کردار ادا کیا، جنوبی ایشیا میں چین اور بھارت کے درمیان بڑھتی ہوئی مسابقت نے بہت کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے سے قبل کبھی بھی بھارت نے پڑوسی ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو خطرے میں محسوس نہیں کیا۔ اس حوالے سے جنوبی ایشیا کی ترقی پر خرچ کرنے والے جاپان اور دیگر اہم ممالک سے بھارت کو مسابقت کا احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن چین کے عروج نے بھارت کی پریشانی میں اضافہ کردیا ہے۔ بھارت کو خدشہ ہے کہ بیجنگ کے اثرات خطے میں نئی دہلی کے قائدانہ کردار کو متاثر کریں گے۔

جنوبی ایشیا میں چین کے بڑھتے ہوئے سفارتی اثرات عالمی سطح پر بڑی طاقت کا کردار ادا کرنے کی خواہش کا عکاس ہیں۔ کسی ابھرتی ہوئی طاقت کی طرح چین بھی موجودہ نظام پر اعتراض کرتے ہوئے اس کو اپنے حق میں تبدیل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ چین کو فائدہ پہنچنے والی کوئی بھی تبدیلی بھارت کے اسٹریٹیجک اور قومی مفاد پر بری طرح متاثر کرے گی۔ چین نے ابتدائی طور پر کچھ سرکاری دستاویزات جاری کرکے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کی، لیکن ان دستاویزات میں منصوبے کی تفصیلات کا ذکر نہیں تھا، جس کے دو برس بعد صدر شی نے سلک روڈ منصوبے کا اعلان کیا۔ مارچ ۲۰۱۵ء میں چینی حکومت نے ''سلک روڈ اکنامک بیلٹ اور اکیسویں صدی میں میری ٹائم سلک روڈ کی مشترکہ تعمیر'' کے عنوان سے جاری دستاویزات میں اپنی حکمت عملی کا اعلان کیا۔

ان دستاویزات میں خطے میں تعاون کے ذریعے روایتی تجارت کے فروغ، انفرااسٹرکچر کی تعمیر، ثقافتی روابط بڑھانے اور مواقع پیدا کرنے پر زور دیا گیا۔ چین نے جیو پولیٹکل تبدیلی کی وضاحت کرتے ہوئے چینی اصول ''تعاون کے ذریعے سب کی جیت'' پر عمل کرنے پر زور دیا۔ خطے کو جوڑنے کے لیے انفرااسٹرکچر کی تعمیر کے حوالے سے چار ترجیحات بیان کی گئیں، جس میں ٹرانسپورٹ، بندرگاہ، ایوی ایشن اور توانائی کے انفرااسٹرکچر شامل ہیں۔ دستاویزات میں مواصلاتی سلک روڈ کی ضرورت کا بھی ذکر کیا گیا، مواصلاتی

سلک روڈ میں مختلف ممالک کے درمیان آپٹیکل کیبل اور زیر سمندر کیبل نیٹ ورکس کی تنصیب کے ساتھ سیٹلائٹ بھیجنے کے منصوبے شامل ہیں۔ دستاویزات میں کچھ اہم مسائل کے بارے میں بات ہی نہیں کی گئی۔ جیسا کہ منصوبوں کے انتخاب کے طریقہ کار، مشاورت کی نوعیت اور مذاکرات کے دورانیے کا ذکر نہیں کیا گیا، جس سے بظاہر لگتا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے اعلان کے کئی برس بعد بھی چین کے پاس کوئی مکمل منصوبہ موجود نہیں ہے اور بیجنگ عالمی برادری کے ردعمل کے مطابق اپنی حکمت عملی بنا رہا ہے۔

ایک نامکمل منصوبے کے ساتھ چین کا دیگر ممالک سے مذاکرات کا آغاز کرنا بھارت سمیت دنیا بھر میں شک کے نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ منصوبہ آگے بڑھنے کے ساتھ ہی اس کے مقاصد، طریقہ کار اور شفافیت کے فقدان کے حوالے سے دیگر ممالک کے خدشات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان خدشات پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے چین کا کہنا تھا کہ ''ہمیں سرد جنگ کی ذہنیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے، ہمارا اس منصوبے کے ذریعے خطے پر اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کرنے کا کوئی خفیہ تزویراتی ایجنڈا نہیں ہے، اس منصوبے سے دوسرے ممالک کی خودمختاری کو کوئی خطرہ نہیں ہے''۔ تمام تر خامیوں کے باوجود چین مسلسل بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کو خطے میں اپنے اثرات بڑھانے اور قائدانہ کردار حاصل کرنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

صدر شی جن پنگ نے جب ۲۰۱۳ء میں بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا اعلان کیا تو واشنگٹن میں ''شٹ ڈاؤن'' جاری تھا، جس کی وجہ سے امریکی صدر نے ایشیا کا دورہ منسوخ کر دیا، جس سے ایشیا میں امریکی کردار کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ بیجنگ نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خلا کو پر کر دیا اور خود کو ایشیا کی ''نئی قیادت'' کے طور پر متعارف کروایا۔ ۲۰۱۴ء کے وسط میں صدر شی جن پنگ نے ''ایشیا صرف ایشیائی افراد کے لیے'' کا بیان مسلسل دینا شروع کر دیا۔ چین نے علاقائیت کو فروغ دیا اور خود کو خطے کے ممالک کے مسائل حل کرنے والا ملک بنا کر پیش کیا۔ صدر شی جن پنگ نے ۲۰۱۴ء میں لکھا کہ ''ایشیا کے معاملات چلانے کے لیے، ایشیا کی سلامتی کے لیے اور ایشیا کے مسائل کے حل کے لیے ایشیائی افراد ہی موزوں ہیں، چین ایشیا کی سلامتی کے تصور کا زبردست حامی ہے اور اس تصور کو عملی شکل دینے کے لیے کام بھی کر رہا ہے''۔ پیغام بہت واضح ہے کہ ایشیائی ممالک کو تعمیر اور ترقی کے معاملات میں بیرون ایشیا ممالک پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے پس پردہ پیغام بھی بہت واضح تھا کہ چین خطے کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہے۔

۲۰۱۳ء کے بعد سے چین تقریباً ہر دو طرفہ بات چیت میں بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ پر گفتگو کر رہا ہے، تاکہ منصوبے کے حوالے سے مثبت تاثر کو مضبوط کیا جا سکے۔ منصوبے کی ساکھ قائم کرنے کے لیے بین الاقوامی حمایت حاصل کرنا چین کے لیے آسان راستہ تھا، لیکن پھر بھی منصوبے کی تفصیل اور شفافیت کے حوالے سے کافی خدشات موجود رہے۔ اگرچہ بیجنگ نے ہر فورم پر بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی چین ۲۰۱۷ء سے قبل بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے حوالے سے کوئی معاہدہ نہیں کر پایا۔ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں چین کے پہلے سے جاری منصوبوں کو یکجا کر کے ایک پیکیج بنایا گیا اور اس کو نئے کثیر الملکی منصوبے کے طور پر پیش کیا گیا۔ بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ کے حوالے سے سب سے پہلا معاہدہ سی پیک کا تھا، اس حوالے سے اب بھی کئی راہداریوں اور بندرگاہوں کے منصوبوں پر بات چیت جاری ہے اور معاہدے کو حتمی شکل نہیں دی جا سکی ہے۔ گوادر کی بندرگاہ سی پیک کا حصہ ہوتے ہوئے بھی چین کی میری ٹائم سلک روڈ کے نقشے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ تسلسل کی کمی اور منصوبے پر عمل درآمد سے متعلق تفصیلات کی عدم موجودگی کی وجہ سے بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ کے حوالے سے کئی سوالات نے جنم لیا۔ بڑھتے ہوئے خدشات کی وجہ سے ہی چین نے ۲۰۱۷ء میں پہلے بیلٹ اینڈ روڈ فورم کا انعقاد کیا۔ مئی ۲۰۱۷ء میں ہونے والا فورم بیجنگ کی جانب سے منصوبے کے لیے بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کی سب سے بڑی سفارتی کوشش تھی۔ فورم بین الاقوامی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور حاضری بھی زبردست رہی۔ چینی حکام کے مطابق ''بیلٹ اینڈ روڈ فورم میں ۱۳۰ ممالک کے ۱۵۰۰ وفود نے شرکت کی، جس میں ۲۹ سربراہان مملکت بھی شامل تھے''۔ اس حوالے سے کچھ مبصرین نے چینی حکام پر اعداد وشمار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا الزام بھی لگایا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں چینی صدر شی جن پنگ کا کہنا تھا کہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے روٹ میں شامل ممالک کے ساتھ ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۶ء کے درمیان چین نے ۳ کھرب ڈالر سے زائد کی تجارت کی، چین منصوبے میں شامل ممالک میں مزید ۵۰ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا، جس سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار نوکریاں پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ انفرااسٹرکچر کی تعمیر میں چین کے اہم ترین کردار کی وجہ اس کے پاس اضافی سرمائے کی موجودگی ہے۔ امریکا، جاپان اور بھارت میں سے کوئی بھی چین کی طرح راہداریوں کی تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے قابل نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق چین مختلف منصوبوں پر تقریباً ۴ کھرب ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا، اس سے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے حوالے سے چینی سوچ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جاپان اور اس کے اتحادی مل کر بھی تجارتی راہداریوں کی تعمیر کے معاملے میں چین کے سرمائے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ترقی پذیر ممالک میں منصوبوں کی تعمیر میں سرمائے کی فراہمی کے علاوہ بھی کئی چیلنجوں کا سامنا ہوتا ہے۔ چین نے بیرون ملک سرمایہ کاری اور منصوبوں کے انتخاب پر مکمل طور پر اپنا کنٹرول قائم رکھا ہے۔ جب کہ اتحادی ممالک کی منصوبوں کے انتخاب اور اس پر عمل درآمد کے حوالے سے اپنی ترجیحات ہوں گی، اس حوالے سے کوئی بھی مشاورتی عمل منصوبوں کی تکمیل میں تاخیر کا باعث ہوگا۔

چین نے اپنی کوششوں کو بڑھاتے ہوئے سلک روٹ فنڈ، چینی ترقیاتی بینک، ایکسپورٹ امپورٹ بینک اور دیگر اداروں کے ذریعے مزید سرمایہ کاری کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ منصوبوں پر عمل درآمد میں حائل رکاوٹیں، بین الاقوامی معیار کے مطابق کام نہ کرنا، انتہائی بلند شرح سود اور قرضوں کا بھاری بوجھ چینی کوششوں کو ناکام بنا سکتے ہیں، ایسے میں چین کے پاس اضافی سرمائے کی موجودگی کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اعتماد کے فقدان اور شفافیت کی کمی کی وجہ سے چین بیلٹ اینڈ روڈ فورم میں سب کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ فورم میں بڑی تعداد میں شرکا کی موجودگی کے باوجود چین تمام قوموں کی جانب سے دستخط شدہ مشترکہ اعلامیہ جاری کرانے میں ناکام رہا۔ اعلامیے پر صرف ۳۰ ممالک کی جانب سے دستخط کیے گئے، جن میں بھارت کے پڑوسی میانمار، پاکستان اور سری لنکا بھی شامل تھے۔ چینی تجزیہ نگار کے مطابق ''اس صورتحال سے ظاہر ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کو آگے بڑھانے میں روس، کرغزستان، تھائی لینڈ، پاکستان اور انڈونیشیا سب سے زیادہ تعاون کر رہے ہیں''۔ امریکا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا اور جاپان نے فورم میں شرکت کرتے ہوئے بھی مشترکہ اعلامیہ پر دستخط نہیں کیے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ممالک بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے اور

چینی عزائم کے حوالے سے شدید خدشات رکھتے ہیں۔چین نے فورم کے انعقاد سے ایک دن قبل نیپال کی حمایت حاصل کی اور بھارت کے ۶ پڑوسی ممالک پاکستان، سری لنکا، بنگلادیش، نیپال، میانمار اور افغانستان کے ساتھ نئے معاہدوں پر دستخط بھی کیے۔ پاکستان، سری لنکا اور نیپال کی قیادت نے فورم سے خطاب میں صدر شی جن پنگ کو خطے میں قائدانہ کردار ادا کرنے پر مبارکباد دی اور اپنے اپنے ممالک میں چینی سرمایہ کاری کا خیر مقدم کیا۔

حقیقت میں بھارت کی غیر موجودگی کی وجہ سے چین کو جنوبی ایشیائی ممالک کی طرف سے زبردست حمایت حاصل کرنے کا موقع مل گیا، اس حوالے سے کئی چیزیں اہم ہیں۔ بھارت اپنے پڑوسی ممالک میں ترقیاتی کام کرانے کی پیشکش کرنے میں ناکام رہا تھا۔اس ناکامی کی وجہ سے چھوٹے پڑوسی ممالک نے دوسری ابھرتی طاقت کو اپنے ہاں خوش آمدید کہا اور ایک ایسی مسابقت کا حصہ بن گئے، جس کے نتیجے میں طاقت کا توازن بدل جائے گا۔اس صورتحال نے پڑوسی ممالک کے ساتھ بھارت کے اسٹریٹیجک تعلقات کی کمی کو واضح کردیا۔ اگر چہ وزیراعظم مودی نے ''پڑوسی سب سے اہم'' کی پالیسی اپنا کر اس غلطی کو درست کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ چین نے بیلٹ اینڈ روڈ فورم میں بھارت کو شریک کرانے کے لیے جارحانہ کوششیں کیں۔نئی دہلی کی فورم میں موجودگی دو وجوہات کی بنا پر اہم تھی، پہلی یہ کہ فورم میں بھارتی حکومت کی موجودگی سے لگتا کہ اس نے خطے میں چین کے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کو تسلیم کرلیا ہے۔ اگر بھارت فورم میں شرکت کرکے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو اس سے پڑوس میں چین کے بڑھتے اثرات پر اس کے خدشات کمزور ہونے کا تاثر جاتا۔دوسری یہ کہ دیگر اہم ایشیائی ممالک کے ہمراہ بھارت کی فورم میں موجودگی سے صدر شی جن پنگ کا ''ایشیا صرف ایشیائی افراد کے لیے'' والا بیان عملی طور پر اہمیت اختیار کرجاتا۔ بہر حال اپنے پڑوس میں چین کے راہداری اور انفرااسٹرکچر منصوبوں کے حوالے سے بھارت میں مزاج تبدیل ہوتا جارہا ہے۔چین کی سفارتی یقین دہانیاں بھارت کے اسٹریٹیجک خدشات کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں تھیں، جس کے بعد نئی دہلی نے فورم میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔جنوبی ایشیا اور بحر ہند میں چین کے انفرااسٹرکچر منصوبوں میں مسلسل اضافے کے بعد بھارت میں بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے مضمرات پر گفتگو کا آغاز ہوا۔

بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ سیاسی طور پر بھارت میں مسلسل زیر بحث رہا، بھارت میں بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے اور مئی کے فورم میں شرکت کرنے کے حق میں اور مخالفت میں سیاسی آوازیں کافی مضبوط رہیں۔شرکت کے حامیوں کا کہنا تھا کہ بھارت بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا حصہ بن کر فائدہ حاصل کرسکتا ہے، اس منصوبے سے مقامی انفرااسٹرکچر پراجیکٹ کے لیے سرمایہ حاصل کرنے میں مدد ملے گی، اس کے علاوہ ملک اور تجارتی راہداریوں سے کٹے ہوئے جنوب مشرقی علاقے کو معاشی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔منصوبے میں شرکت کی حامیوں کا مزید کہنا تھا کہ تجارتی راہداریاں ''انڈو پیسفک'' خطے میں زبردست تحرک پیدا کریں گی، نئی دہلی کو اپنی معاشی ترقی کے لیے اس پر غور کرنا چاہیے، اس موقع کو نظر انداز کرنے پر بھارت پیچھے رہ جائے گا۔ان تمام ممکنہ فوائد کے باوجود بھارت میں بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے مخالفین کی جیت ہوئی۔ بھارت کو چینی سرمائے سے جاری بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے حوالے سے کچھ بنیادی خدشات لاحق ہیں۔نئی دہلی کو خدشہ ہے کہ چینی سرمائے سے تعمیر ہونے والا انفرااسٹرکچر تسلیم شدہ عالمی معیار کے مطابق نہیں ہے، یہ منصوبہ بھارت کی خودمختاری اور سیکیورٹی مفادات کو متاثر کرتا ہے، خاص کر چین اور پاکستان کے درمیان زیر تعمیر منصوبوں کے علاقے پر بھارت کا دعوی ہے۔اس منصوبے سے چین کو زبردست سیاسی وجغرافیائی طاقت ملتی ہے اور وہ بھارت کے پڑوسی ممالک کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے لیے اپنی معاشی اور سفارتی طاقت استعمال کرسکتا ہے، جس سے بھارت کے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ بیلٹ اینڈ روڈ فورم میں موجود نہ ہونے کے باوجود وہاں بھارتی موقف چھایا رہا۔ کیا بھارت کو فورم میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی کے سوال کے جواب میں بھارتی وزارت خارجہ نے منصوبے پر شدید خدشات کا اظہار کردیا۔ وزارت خارجہ کے بیان کے مطابق ''ہمارا مضبوط یقین ہے کہ خطے کو جوڑنے کے منصوبوں کی بنیاد تسلیم شدہ عالمی معیار، اچھی انتظامیہ، قانون کی بالادستی، مساوات اور شفافیت پر ہونی چاہیے، ان منصوبوں کو مالی قواعد کا پابند ہونا چاہیے اور منصوبوں کے ذریعے قوموں کو ناقابل برداشت قرض تلے دبانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ماحولیات کا تحفظ، منصوبوں کی مالیت کا تخمینہ لگانے میں شفافیت، مقامی آبادی کی مدد کے لیے ٹیکنالوجی کی منتقلی بھی بہت اہم ہے، ان منصوبوں میں حاکمیت اور علاقائی خودمختاری کا خیال رکھا جانا بھی ضروری ہے''۔ بھارتی حکومت کے بیان کے مطابق بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ اچھی انتظامیہ، قانون کی حکمرانی اور شفافیت کے اصول پر پورا نہیں اترتا۔بیان سے پتا لگتا ہے کہ منصوبے میں شریک ممالک کے لیے قرضوں کا بوجھ ناقابل برداشت ہے، مثال کے طور پر سری لنکا پر چین کا بڑھتا ہوا قرض ناقابل برداشت قرضے کے خدشات کو ہوا دیتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات اور تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے حوالے سے چین کا رویہ ناقابل برداشت قرض کے خطرے کو بڑھا رہا ہے، جس کا کئی ممالک شکار ہوسکتے ہیں، ہمبنوٹا ناقابل برداشت قرض کی زبردست مثال ہے۔ جس کی وجہ سے چین کو بحر ہند میں اہم معاشی اور تزویراتی فوائد حاصل ہوگئے۔

بھارت نے جون ۲۰۱۷ء میں امریکا سے دوطرفہ مذاکرات کے دوران بھی چینی منصوبے پر خدشات کا اظہار کیا، اسی لیے بھارت اور امریکا کے مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ ''ہم دونوں ممالک شفاف ترقیاتی منصوبوں اور ذمے دارانہ قرض کی فراہمی کے ذریعے علاقے میں تجارتی راہداری تعمیر کرنے کی حمایت کرتے ہیں، ان منصوبوں کی تعمیر میں دوسرے ممالک کی خودمختاری، علاقائی سلامتی، قانون کی بالادستی اور ماحول کا خیال رکھا جانا بھی ضروری ہے۔ ہم تمام ممالک سے ان اصولوں کی پاسداری کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں''۔ چین کی جانب سے ان معاشی منصوبوں کو تنازع علاقوں کے حوالے سے موقف تبدیل کرانے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے، جس پر بھارت کے خدشات میں اضافہ ہورہا ہے۔ بھارت کے مئی ۲۰۱۷ء کے بیان میں دعویٰ کیا گیا کہ چین نے علاقائی سلامتی کو مکمل طور پر نظر انداز کردیا ہے، خاص طور پر سی پیک منصوبہ، جو کشمیر کے تنازع علاقے سے گزر رہا ہے۔ بھارت کے مطابق یہ اس کی خودمختاری کی خلاف ورزی ہے اور بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں شرکت سے کشمیر پر اس کے موقف کو نقصان پہنچے گا، کیوں کہ بیجنگ کشمیر پر پاکستانی موقف کی حمایت کرتا ہے۔سی پیک اور بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ کے دیگر منصوبوں میں علاقائی خودمختاری کے حوالے سے بھارت کے خدشات کو مکمل نظر انداز کردیا گیا ہے۔ بھارت کے مشرقی علاقے اروناچل پردیش اور شمالی علاقے لداخ پر چین کا دعویٰ ہے، ۱۹۶۲ء کی بھارت اور چین جنگ لداخ اور اروناچل پردیش کے لیے ہی لڑی گئی تھی۔سرحدی

باقی صفحہ نمبر ۹

امریکی انتظامیہ کی تختے اُلٹنے کی روش

Prof. James Petras

امریکا آج کل جنوبی امریکا کے ملک وینزویلا میں منتخب اور خودمختار حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسی کوششوں کے قلیل المیعاد، طویل المیعاد اور اوسط المیعاد نتائج کے حوالے سے تاریخ کا ریکارڈ ملا جُلا ہے۔ امریکا کم و بیش ۷۰ عشروں سے لاطینی امریکا اور کیریبین (جزائرِ غرب الہند) کے خطے میں حکومتیں بدلنے کی کوششیں کرتا رہا ہے۔ کامیابیاں اور ناکامیاں ملی جُلی ہیں۔ امریکا نے وینزویلا میں بھی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی کوششیں کم و بیش نصف صدی سے جاری رکھی ہیں۔

وینزویلا: ۱۹۵۰ء تا ۲۰۱۹ء نتائج اور تناظر

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے امریکا بین الاقوامی امور میں اپنی بالادستی برقرار رکھنے کی خاطر لاطینی امریکا اور جزائرِ غرب الہند کے خطے میں حکومتوں کا تختہ الٹتا آیا ہے۔ اس حوالے سے کیوبا، برازیل، چلی، بولیویا، پیرو، گوئٹے مالا، نکاراگوا، پاناما، وینزویلا اور دوسرے بہت سے کمزور ممالک کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔

امریکی قیادت نے وینزویلا میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء تک پیریز جمینیز کی فوجی آمریت کو سہارا دیا۔ ۱۹۵۸ء میں پیریز جمینیز کی فوجی آمریت کا تختہ پلٹ دیا گیا۔ عبوری مدت کے لیے منتخب حکومت قائم ہوئی۔ یہ حکومت بائیں بازو کے عناصر نے قائم کی تھی۔ امریکا نے جب دیکھا کہ بائیں بازو کے عناصر مضبوط ہوگئے ہیں تو اُس نے پالیسی تبدیل کی اور وینزویلا میں دائیں بازو کے سیاسی عناصر کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ اور یوں کم و بیش چار عشروں تک سوشل اور کرسچین ڈیموکریٹس کو اقتدار سے ہم کنار رکھا گیا۔

امریکی حمایت سے قائم ہونے والی حکومتیں بدعنوانی سے آلودہ ہوتی گئیں اور ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ان کی خرابی اس قدر بڑھ گئی کہ ملک سیاسی و معاشی بحرانوں سے دوچار ہوا اور پھر عوام نے انہیں ہٹا کر بائیں بازو کے استعمار مخالف عناصر کو اقتدار دیا۔ یوں ہیوگو شاویز کی حکومت قائم ہوئی۔ صدر ہیوگو شاویز نے انتخابی معرکوں میں امریکی حمایت یافتہ امیدواروں کو دو عشروں تک شدید ناکامی سے دوچار کیا۔

صدر مدورو کے انتخاب کے بعد واشنگٹن نے ایک بار پھر وینزویلا میں اپنی مرضی کی حکومت لانے کے لیے حکومت کا تختہ الٹنے کی بھرپور کوشش کی اور اس حوالے سے سیاسی مشینری کھل کر بروئے کار لائی گئی۔

وینزویلا میں امریکی مداخلت کے نتائج کا ریکارڈ ملا جلا رہا ہے۔ وسط مدتی فوجی بغاوت کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت ایک عشرے سے کم چلی۔ اس کے بعد چار عشروں تک امریکا کی حمایت سے منتخب ہونے والی حکومتوں کا دور چلا۔ اس کے بعد بائیں بازو کے عناصر نے دو عشروں تک خود کو منوایا۔

وینزویلا کے تجربے سے بہت کچھ عیاں ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ امریکا اپنی طاقت کے ذریعے بہت کچھ منواتا ہے۔ کمزور ممالک میں سیاسی عناصر کو دانہ ڈال کر اپنے دام میں کرنا امریکا کا پرانا وتیرہ ہے۔ وینزویلا تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ اس قومی دولت پر بھی امریکا اپنے پٹھوؤں کو کنٹرول دلاتا ہے۔ مختلف طریقوں سے تحریص و ترغیب دے کر امریکا اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرتا ہے اور کام چلاتا رہتا ہے یعنی پورا ملک اُس کی مٹھی میں آجاتا ہے اور پھر معاملات صرف خرابی کی طرف جاتے ہیں۔

وینزویلا میں واضح امریکی حمایت سے قائم ہونے والی حکومتیں اب تک بہت کمزور اور نااہل ثابت ہوئی ہیں۔ حکمراں طبقہ بہتر انداز سے حکمرانی کا اہل نہیں۔ تیل کی دولت پر اس کا گزارا ہے۔ اس طبقے کو عوام میں مقبولیت بھی کبھی حاصل نہیں رہی۔ حکومت چلانے کے لیے امریکا کی فوجی طاقت پر بھروسا کرنا پڑا ہے اور یہی اس طبقے کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔

علاقائی تناظر میں کٹھ پتلی حکومتوں کا قیام

امریکی استعماری ریاست خطے میں کٹھ پتلی حکومتوں کے قیام کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے بروئے کار لاتی ہے۔ اس حوالے سے نتائج متعلقہ ریاستوں کی قوم سازی سے متعلق صلاحیت و سکت کے تناظر میں متنوع ثابت ہوتے رہے ہیں۔ آسانی سے ہدف پذیر ہو جانے والی معیشت کے حامل چھوٹے ممالک میں کٹھ پتلی حکومت کا قیام امریکا کے لیے قدرے آسان رہا ہے۔ امریکا نے گوئٹے مالا میں جو فوجی بغاوت برپا کی وہ ۱۹۵۴ء سے اب تک برقرار رہی ہے۔

بہت سے چھوٹے ممالک میں عوامی سطح پر رونما ہونے والے ردعمل اور حکومتی تبدیلی کی کوششوں کو امریکی مشیروں اور امداد کی مدد سے کچلا جاتا رہا ہے۔ پاناما، گرینیڈا، ڈومینکن ری پبلک اور ہیٹی میں امریکی حاشیہ برداروں پر مشتمل کٹھ پتلی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں۔ یہ تمام ممالک چھوٹے ہیں اس لیے امریکا کے لیے انہیں کنٹرول کرنا، ان ممالک پر براہِ راست حملہ کرکے تمام معاملات کو ہاتھ میں لینا اور اپنی مرضی کے مطابق معاملات چلانا کبھی دشوار نہیں رہا۔ ان تمام ممالک میں امریکا مختلف ادوار میں فوجی بغاوت کے ذریعے اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس حوالے سے نتائج ملے جلے رہے ہیں مگر یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ امریکا نے اپنے مفادات کو تقویت بہم پہنچانے میں نمایاں حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

ہونڈراس کے کیس میں امریکا نے لبرل ڈیموکریٹک حکومت کو بہت مختصر مدت میں پلٹ دیا۔ ہونڈراس کی فوج بہت چھوٹی ہے۔ جب امریکا نے سرپرستی پر آمادگی ظاہر کی تو ہونڈراس کی فوج نے منتخب حکومت کا تختہ الٹنے میں دیر نہیں لگائی۔ صدر مینوئل زلایا نے غیر مسلح عوامی مقبولیت پر انحصار کیا اور اقتدار سے محروم ہوئے۔ یہ فوجی بغاوت کم و بیش ایک عشرے تک کسی الجھن کے بغیر قائم رہی اور ایسا لگتا ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک پاپولر فرنٹ اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک سوشل ڈیموکریٹس کی حکومت کے سوا جنوبی امریکا کا ملک چلی بیسویں صدی کے بیشتر حصے میں امریکا کی قائم کردہ کٹھ پتلی حکومتوں کا حامل رہا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں امریکا نے ایک بار پھر چلی میں منتخب حکومت کا تختہ الٹا اور اپنے حاشیہ بردار جنرل پنوشے کو اقتدار سونپا۔ پنوشے کا اقتدار کم و بیش ۱۷ سال برقرار رہا۔ پنوشے کا اقتدار ختم ہونے پر ایک ایسی منتخب حکومت قائم ہوئی، جس نے امریکا کے دیے ہوئے ایجنڈے پر عمل جاری رکھا۔ قومی اور سماجی سطح کی بہت سی اصلاحات کو رول بیک کرلیا گیا۔ کم و بیش نصف صدی تک چلی مکمل طور پر امریکا کے دائرۂ اثر میں رہا۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء کے دوران چلی کا نظم و نسق سنبھالنے والی سوشل ڈیموکریٹک حکومت نے نہ تو عوام کو عسکری اعتبار سے مضبوط کرنے پر توجہ دی اور نہ ہی ایسے اقتصادی روابط استوار کرنے کی کوشش کی، جو ملک کو جمہوریت کی راہ پر زیادہ دیر تک گامزن رکھ سکے۔ ایسے میں یہ

بات زیادہ حیرت انگیز نہیں کہ چلی کی حکومت نے حال ہی میں امریکا کی طرف سے وینزویلا کے صدر مدورو کا تختہ الٹنے کی کال کو بظاہر بخوشی سنا ہے۔

کٹھ پتلی حکومت بنانے کا متضاد عمل

ایسا نہیں ہے کہ امریکا کو ہر ملک میں بھرپور کامیابی نصیب ہوئی۔ کیوبا کی مثال بہت واضح ہے۔ ایک عشرے تک قائم رہنے والی باٹسٹا آمریت کو عوام کی مدد سے بائیں بازو کے عناصر نے بہت عمدگی سے پچھاڑا اور اس کے بعد سے اب تک یعنی کم و بیش ۶ عشروں کے دوران کیوبا میں امریکا کی حمایت یافتہ حکومت قائم نہیں کی جاسکی ہے۔ فیڈل کاسٹرو کیوبا پر امریکا کے حملے کی راہ روکنے میں اس لیے کامیاب رہے کہ انہوں نے اس حوالے سے تمام ضروری تیاریاں کیں۔ کیوبا میں کام کرنے والے ایسے تمام امریکی اور یورپی کاروباری اداروں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا، جو منافع خوری پر یقین رکھتے تھے اور کیوبن عوام کا خون چوس رہے تھے۔ عوام کو لازمی عسکری تربیت دی گئی تاکہ امریکا یا اس کے کسی ہم نوا کے حملے کا ڈٹ کر سامنا کیا جاسکے۔ فیڈل کاسٹرو نے ملک کو زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھنے کے لیے سابق سوویت یونین، چین اور آخر میں وینزویلا سے اسٹریٹجک تعلقات استوار کیے۔

امریکا نے ۱۹۶۴ء میں برازیل میں فوجی بغاوت کا اہتمام کیا اور پھر دو عشروں تک وہاں کٹھ پتلی حکومتیں ہی کام کرتی رہیں۔ اس کے بعد حکمراں طبقے نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے منتخب حکومتوں کا ایک دور چلایا۔ نیولبرل ڈیموکریٹک معاشی پالیسیوں کی ۲۰ سالہ ناکامیوں نے سماجی اصلاحات کا نعرہ لگانے والی ورکر پارٹی کو غربت مٹانے کے حوالے سے پروگرام شروع کرنے کی تحریک دی۔

کم و بیش ڈیڑھ عشرے تک برازیل میں سماجی اصلاحات کا عمل جاری رہا اور خارجہ پالیسی بھی بہت حد تک خود مختار رہی۔ اس کے بعد ورکر پارٹی نے کموڈٹیز پر منحصر معیشت اور فوج و عدلیہ کے دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد امریکا کی سرپرستی میں دو حکومتیں قائم ہوئیں جنہیں وال اسٹریٹ اور پینٹاگون کی حمایت حاصل تھی اور انہی کی ہدایات پر یہ عمل پیرا بھی رہیں۔

امریکا نے بولیویا میں بھی کئی بار مداخلت کی ہے۔ وہاں فوجی بغاوتوں کی راہ ہموار کی ہے اور ۱۹۵۴ء، ۱۹۷۰ء اور ۲۰۰۱ء میں قائم ہونے والی مختصر المیعاد منتخب حکومت کے مقابل کٹھ پتلی حکومتیں قائم کی ہیں۔

۲۰۰۵ء میں عوامی بیداری کی لہر اٹھی تو آزادانہ انتخابات کی راہ ہموار ہوئی اور کوکا کاشت کاروں کی تحریک کے راہنما ایوو مورالیز کو اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔ ۲۰۰۵ء سے اب تک ایوو مورالیز نے استعمار مخالف اعتدال پسند لبرل حکومت کی قیادت کی ہے۔ امریکا نے برازیل میں ایوو مورالیز کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کئی کوششیں کی ہیں مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایوو مورالیز نے کسانوں اور شہری محنت کشوں کے اتحادوں کو منظم کرکے متحرک کیا ہے۔ ان میں کان کنی سے وابستہ افراد اور کوکا کے کاشت کار بھی شامل ہیں۔ انہوں نے فوج کی حمایت حاصل کرنے میں بھی بہت حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ ایوو مورالیز نے امریکا کی آنکھ کا تارا سمجھے جانے والے امدادی اداروں کو نکالا، تیل اور گیس کی پیداوار کے شعبے پر کنٹرول کو مستحکم کیا اور زرعی کاروباری اداروں سے تعلقات کو وسعت اور استحکام بخشا۔ قدرے آزاد خارجہ پالیسی، مخلوط معیشت، بلند شرح نمو اور اعتدال پسند اصلاحات نے کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے سے متعلق امریکی کوششوں کو ناکامی سے دوچار کیا ہے۔

ارجنٹائن کے کیس میں ایسا نہیں ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں امریکا نے ایک ایسی فوجی بغاوت کی راہ ہموار کی، جس کے نتیجے میں فوج نے ۳۰ ہزار شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ارجنٹائن کی فوج کو برطانوی فوج نے Malvinas کی جنگ میں شکست سے دوچار کیا اور یوں فوج ۷ سال اقتدار میں رہنے کے بعد پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔

اقتدار سے فوج کے نکل جانے کے بعد قائم ہونے والی کٹھ پتلی حکومت نے ایک عشرے تک ریاستی وسائل کی بندر بانٹ کی اور ۲۰۰۱ء میں خاتمے پر آئی۔ اس حکومت کو ختم کرنے میں عوامی انقلاب نے کلیدی کردار ادا کیا۔ خیر، بائیں بازو کے انقلابی اتحاد میں زیادہ دم نہ تھا۔ اس کی جگہ اعتدال پسند اور بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والی حکومتیں قائم ہوئیں جنہوں نے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۵ء کا دور گزارا۔ ترقی پسند سوشل ویلفیئر اور نیولبرل حکومتیں بھی آئیں کہ بحران کے خاتمے کی راہ ہموار کریں مگر انہیں امریکا کی حمایت سے بننے والی کٹھ پتلی حکومتوں نے نکال باہر کیا اور اصلاحات کے عمل کو رول بیک کیا، معیشت کو ایک بار پھر سرکاری تحویل سے نکالا اور ریاست کو امریکی بینکر اور سٹے بازوں کا حاشیہ بردار بنادیا۔ یہ ۲۰۱۵ء کی بات ہے۔

دو سال اقتدار میں رہنے کے بعد اس کٹھ پتلی انتظامیہ نے بھی سنگین غلطیاں کیں۔ معیشت کا زوال شروع ہوا۔ ریاستی مشینری نے جبر و استبداد کا نیا سلسلہ شروع کیا اور عوام نے بڑے پیمانے پر احتجاج کی ٹھانی۔ امریکی حمایت یافتہ کٹھ پتلی حکومت کا اقتدار ایک بار پھر خطرے میں ہے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں عوام کا احتجاج جاری ہے۔ دوسری طرف پینٹاگون کوئی سبق سیکھنے کے بجائے موجودہ کٹھ پتلی حکومت کو ختم کرکے نئے حاشیہ بردار لانے کے لیے خنجر تیز کر رہا ہے۔

خلاصہ

بڑے ممالک میں امریکا اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ بڑے ممالک میں ادارے بھی مضبوط ہوتے ہیں اور خاص طور پر فوج کو کنٹرول کرنا آسان نہیں ہوتا۔ برازیل اور چلی میں امریکا نے منتخب یا مخالف حکومتوں کی بساط لپیٹنے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے مگر وہ اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنے میں بھی زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ چھوٹے ممالک میں تو امریکا فوجی بغاوت یا براہِ راست حملوں کے ذریعے اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنے کی روش پر گامزن ہے تاہم بڑے ممالک کے حوالے سے اس نے ہمہ جہت حکمتِ عملی اپنا رکھی ہے۔ ان ممالک کو اپنے بس میں کرنے کے لیے امریکا ابلاغ عامہ کے ذرائع سے بھی کام لیتا ہے اور آمریت کو جمہوریت کے روپ میں پیش کرنے پر بھی اکتفا کرتا ہے۔ انتہا پسندی کو فروغ دیا جاتا ہے اور کرپشن کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ساتھ سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کی دھمکی بھی دی جاتی ہے۔ جب کشیدگی بڑھتی ہے تب خطے کی کٹھ پتلی حکومتیں اور یورپی ریاستیں مقامی کٹھ پتلی حکومتوں کی حمایت کرتی ہیں۔ امریکا کو ایسے حکمران پسند ہیں جو شور بہت مچاتے ہوں اور کرتے کچھ بھی نہ ہوں۔ ایسے تمام حکمرانوں کو امریکی صدر دوستی اور تعاون کا تاج پہناتے ہیں۔ امریکی صدر کی انگشتِ شہادت کا ایک اشارا کروڑوں ووٹر کی رائے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے۔ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کی منصوبہ سازی اور فنڈنگ کے ذریعے کرائے جانے والے مظاہروں اور تشدد سے معیشتیں غیر مستحکم کی جاتی ہیں۔ کاروباری اشرافیہ پیداوار و تقسیم کے عمل کو شدید منفی اثرات سے دوچار کرتے ہیں۔ ججوں اور فوجی حکام کو رشوت کی مد میں کروڑ ڈالر پیش کیے جاتے ہیں۔

اگر اقتدار کی تبدیلی متعلقہ ملک کی فوج کے ہاتھوں عمل میں آجائے تو امریکا براہِ راست حملے اور مداخلت سے باز رہتا

ہے۔ بڑی اور قدرے مالدار ریاستوں میں حکومتوں کی تبدیلی ایک سے دو عشروں پر محیط ہوتی ہیں۔ انتخابی عمل کے ذریعے معرضِ وجود میں آنے والی کٹھ پتلی حکومت استعماری مقاصد کی تکمیل میں زیادہ معاون و ممد ثابت ہوتی ہیں کیونکہ عوام کو ان پر بہت حد تک اعتبار ہوتا ہے۔ چلی کے معاملے میں یہی ہوا۔

جہاں جمہوری حکومت کے لیے غیر معمولی عوامی حمایت پائی جاتی ہو وہاں امریکا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کے لیے ''نظریاتی'' اور عسکری امداد فراہم کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ارجنٹائن کے کیس میں یہی ہوا تھا۔

وینزویلا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بہت خطرناک ہے کیونکہ حکومت کی تبدیلی کا عمل بہت بڑے پیمانے پر قتلِ عام کی راہ بھی ہموار کرسکتا ہے۔ امریکا کو یہ بات کسی طور پر پسند نہیں کہ عوام اپنے ملک کی بھلائی کا سوچیں، اسے مستحکم کریں اور جو کچھ انہیں خاص طویل جدوجہد کے نتیجے میں ملا ہے اُسے سلامت رکھ پائیں۔ استحصالی طبقہ اور اس کے حاشیہ بردار یہ بات کسی بھی طور برداشت نہیں کرسکتے کہ غریب عوام کو حقوق ملیں اور وہ ڈھنگ سے جینے کے قابل ہوسکیں۔ وہ عوام کو شدید محرومی کے گڑھے میں گرائے رکھنے کے لیے تشدد سمیت کوئی بھی انتہائی راستہ اختیار کرسکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وینزویلا کے عوام امریکی سلطنت اور اس کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیوں سے حتمی اور فیصلہ کن معرکے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔

(پروفیسر جیمز پیٹراس نے کئی ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔ وہ سینٹر فار ریسرچ آن گلوبلائزیشن کے ریسرچ فیلو ہیں۔)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"US 'Regime Changes': The Historical Record". ("Global Research". February 04, 2019)

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین وحضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضا کارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہوجانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ!

روزگار: تم جب جوان ہوگے، تمہیں شاید کوئی نوکری نہ ملے!

Yuval Noah Harari

ہم نہیں جانتے کہ روزگار کی منڈی ۲۰۵۰ء تک کیا صورت اختیار کرے۔ اس بات پر عمومی اتفاق رائے ہے کہ وہی جمانے سے یوگا سکھانے تک، مشینیں اور روبوٹکس (خدمات) تقریباً ہر کام کی نوعیت اور زاویہ بدل دیں گی۔ تاہم اس تبدیلی کی نوعیت اور وسعت پر مختلف تصورات باہم متصادم ہیں۔ کچھ لوگ یقین رکھتے ہیں کہ ایک یا دو دہائیوں میں اربوں انسان معاشی طور پر بے کار ہوجائیں گے۔ جبکہ دیگر سمجھتے ہیں کہ آٹومیشن روزگار کے نئے ذرائع پیدا کرتا رہے گا، اور سب کی ترقی کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرلیا جائے گا۔

کیا ہم واقعی ایک خوفناک تبدیلی کے قریب پہنچ چکے ہیں، یا پھر محض بے بنیاد ہوائی باتوں کی زد میں ہیں! کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ آٹومیشن کے سبب، بڑے پیمانے پر بے روزگاری کے خدشات انیسویں صدی میں بھی تھے، مگر وہ کبھی حقیقت میں نہ ڈھل سکے۔ جب سے صنعتی عہد شروع ہوا، ہر وہ روزگار جو مشین نے چھینا، اس کی جگہ نیا روزگار پیدا کردیا گیا۔ معیارِ زندگی ڈرامائی رفتار سے بہتر ہوا۔ مگر اس بار صورتحال برعکس ہے، اور ایسا سمجھنے کی کافی معقول وجوہات ہیں۔ اس بار مشین درحقیقت گیم چینجر بننے جارہی ہے۔

انسانوں میں دو طرح کی قابلیتیں ہیں۔ ایک جسمانی اور دوسری عقلی و ادراکی۔ ماضی میں مشینیں انسانوں سے جسمانی مہارتوں میں مقابلہ کرتی رہی ہیں، مگر انسان کی ذہانت اور منصوبہ بندی نے اُسے ہمیشہ بہت آگے خاص مقام پر رکھا ہے۔ جب زرعی و صنعتی روزگار مشینوں نے چھین لیے، تو انسانوں نے وہ سارے کام سنبھال لیے، جن میں دماغی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ مگر اب (Artificial Intelligence) مصنوعی ذہانت کا نیا نظام انسانوں کو اُن سب کاموں سے نکال باہر کرے گا جن میں دماغ استعمال ہوتا ہے۔ جسمانی و دماغی، ہم ان دو انسانی صلاحیتوں کے سوا کسی تیسری انسانی خاصیت سے واقف نہیں، جو اُسے انفو بائیوٹیک انقلاب سے محفوظ و مامون بنا سکے۔ (خالص مادی نکتہ نظر ہے۔ پروفیسر ہراری اور نظریہ ارتقا پر ایمان رکھنے والے حضرات روح کے قائل نہیں۔ مگر انسانوں کی بہت بڑی اکثریت، جو بڑے مذاہب سے تعلق رکھتی ہے، نہ صرف روح سے تعلق رکھتی ہے بلکہ اسے انسانی عزوشرف سمجھتی ہے، اور دیگر مخلوقات سے انسان کو ممتاز بنانے والی یہی وہ صفت ہے، جس کے بغیر انسان واقعی درندہ صفت نظر آتا ہے۔)

یہ سمجھنا انتہائی اہم ہوگا کہ مصنوعی ذہانت کا انقلاب صرف کمپیوٹر کی کارکردگی یا تیز رفتاری سے متعلق نہیں ہے۔ یہ علوم حیاتیات اور علوم سماجیات میں فیصلہ کن تبدیلیاں لانے کی توانائی سے بھرپور ہوگا۔ جیسا کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بائیوکیمسٹری کا مکینزم انسانی جذبات، خواہشات اور پسند ناپسند کو کس طرح تقویت دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح کمپیوٹر بھی انسانی رویوں کا تجزیہ، انسانی فیصلوں کی پیش بینی اور انسانی ڈرائیوروں، بینکر اور قانون دانوں کی جگہ سنبھال سکتے ہیں۔ (یہاں دو باتیں دلچسپ ہیں، ایک یہ کہ انسان کی آزاد خیالی کا مغربی تصور مادی نکتہ نظر سے ہی غلط ثابت کیا جارہا ہے، دوسرا یہ کہ آزاد ارادے کا یہ اختیار اربوں نیوروز کو دیا جارہا ہے اور ان کے اس اختیار پر قابو پانے کے لیے کیمیائی ہتھکنڈوں کے استعمال کو بائیوکیمسٹری کی اکادمی اصطلاح میں قابل قبول بنا کر پیش کیا جارہا ہے، یعنی پہلے انسان پر ظلم کے جو خارجی طریقے تھے، وہ اب ادویات اور طبی تشدد کی صورت اختیار کرلیں گے، حقیقت تو یہ ہے کہ عرصہ دراز سے ایسا ہی ہورہا ہے، LSD کا استعمال واضح مثال ہے۔)

آخری چند دہائیوں میں نیوروسائنس اور معاشی رویوں کے علوم میں تحقیق سے یہ سامنے آیا ہے، کہ سائنس دان بہت حد تک انسانی فیصلوں کو جاننے کے قابل ہوچکے ہیں۔ یہ بھی سامنے آچکا ہے کہ خوراک سے لے کر باہمی تعلقات تک ہماری ہر خواہش کا تعلق کسی 'پراسرار آزاد ارادے' سے نہیں ہے، بلکہ یہ اربوں نیوروز کا وہ حساب و شمار ہے، جو امکانات مدنظر رکھ کر لمحے بھر میں فیصلہ کرتا ہے۔ (پروفیسر صاحب کی دانشوری میں نیوروز کی شماریات کس قدر 'بصیرت افروز' شیخی کا ثبوت دے رہی ہے؟ اس کا ادراک انہیں واقعی نہیں ہے، مگر وہ انسانی دماغ کی خودکاری ثابت کرنے پر جس جذبے اور لگن سے زور دیتے ہیں، وہ از خود 'خودکار مشینی' دماغ کی نفی کررہی ہے۔ ہماری اس رائے میں ہمارے نیوروز کی کوئی من مانی ہرگز نہیں ہے، یہ ہمارا یقین ہے، اگر ہمارا یہ

یقین نیورونز کی شرارت ہے، تب بھی ہم یقین سے کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں؟ اور مزے کی بات یہ کہ بصیرت کی شیخی بھی شیخی نہیں اگر وہ واقعی نیورونز کی شرارت ہے۔)

'انسانی بصیرت و وجدان' کی شیخی دراصل 'صورت یا نمونے کی شناخت' ہے۔ ماہر ڈرائیور، بینکار اور قانون دان کسی جادوئی سمجھ کے سبب ٹریفک، سرمایہ کاری اور بحث و دلائل ممکن نہیں بناتے، بلکہ متواتر پیش آنے والی صورتوں (عادتوں) کی شناخت کے ذریعہ لاپروا راہگیروں، ناتجربہ کار قرض خواہوں اور بددیانت عیار آدمی سے بچتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ انسانی دماغ کے بائیوکیمیکل لیلگورتھم بے عیب نہیں ہیں (یہ عیب جاننے کا دعویٰ محل نظر ہے، کیونکہ اس طرح پروفیسر صاحب کا دماغ بھی بے عیب نہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ ماہر ڈرائیور، سرمایہ کار اور قانون دان بھی احمقانہ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصنوعی ذہانت انسانی دماغ کو بھی پچھاڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کو انسانی روح سے مسابقت کی کوئی ضرورت ہوگی؟ تو یہ ناممکن لگتا ہے! اور اگر AI کو واقعی انسانی نیورون سسٹم سے مقابلہ کرنا پڑ گیا، تو اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ (پروفیسر ہراری AI ورلڈ آرڈر کی خبر دے رہے ہیں۔)

بالخصوص، یہ AI انسانوں کے بہت سارے ایسے کام سنبھال لیں گے، جن میں جھوٹ فریب کے خدشات زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ یہ AI انسانی کیفیات اور رویوں کا بہتر تجزیہ کر سکیں گے۔ یہ بہترین ڈرائیور، بہترین سرمایہ کار اور بہترین قانون دان بن سکیں گے۔ کون سا بچہ کب اچانک سڑک پر آ سکتا ہے؟ اور کیا یہ سوٹڈ بوٹڈ شخص میرا پیسہ لے کر بھاگ تو نہیں جائے گا؟ اور کیا یہ وکیل محض دھمکیاں دے رہا ہے یا واقعی کچھ کر گزرے گا؟ اگر یہ جذبات اور رویے محض بائیوکیمسٹری لیلگورتھم کا نتیجہ ہیں، تو پھر انہیں سمجھنے میں کمپیوٹر کیوں انسانوں سے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ یہ AI چہروں کے تاثرات تک پڑھ سکیں گے، آواز کا اتار چڑھاؤ محسوس کر سکیں گے، ہاتھ پیروں کی حرکات سے اندازہ لگا سکیں گے کہ سامنے والا کیا ہے؟

مستقبل کی نوکریوں کو صرف آٹومیٹک سے ہی خطرہ نہیں ہے، بلکہ بائیونیک بھی بہت بڑی تبدیلیاں لا رہا ہے، دماغ کے سائنسدان ایسی چیزوں پر کام کر رہے ہیں، جو ۲۰۵۰ء تک ماہرین نفسیات اور محافظوں کی جگہ AI کی تقرری ممکن بنا دیں گی۔ AI میں صرف انسانی خوبیاں ہی نہیں بلکہ غیر انسانی صلاحیتیں بھی حیرت انگیز ہیں: ان میں سے ایک بہترین رابطہ اور دوسری اپ ڈیٹنگ کی اہلیت ہے۔ کروڑوں انسانوں کی جگہ سنبھالنے کے لیے کروڑوں روبوٹس یا کمپیوٹروں کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک جدید نیٹ ورک کے ذریعہ بہت کچھ سنبھال سکیں گے۔ مثال کے طور پر ڈرائیور عموماً ٹریفک قوانین سے بہت زیادہ واقف نہیں ہوتے، حادثات کے خدشات ہمیشہ رہتے ہیں، جبکہ باہم ربط وضبط کا نظام AI خودکار گاڑیوں کو حادثات سے بہت زیادہ محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی طرح جب عالمی ادارہ صحت کو کسی نئی بیماری یا دوا کا علم ہوگا، تو تمام ڈاکٹروں کو اس بارے میں اپ ڈیٹ رکھنا ناممکن ہوگا، جبکہ اس کے برعکس اگر دنیا بھر میں دس ارب AI ڈاکٹر بھی ہوں تو فوراً سب ہی اس بیماری اور دوا سے واقف ہو جائیں گے۔ اس سے انسانی معاشرے کو صحت عامہ میں بے حد فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، انتہائی سستا علاج آسان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ٹرانسپورٹ کے شعبہ میں مصنوعی ذہانت کی خدمات انسانوں کے لیے بہت مفید ہو سکتی ہیں، کیونکہ یہ بہت فعال اور غلطیوں سے پاک ہوگی۔

انسانوں کا روزگار بچانے کے لیے ٹرانسپورٹ اور صحت عامہ کے شعبے میں مصنوعی ذہانت کا راستہ روکنا پاگل پن ہوگا۔ کیونکہ ہمیں انسانوں کو محفوظ بنانا ہے، روزگار کو نہیں۔ فارغ ڈاکٹر اور ڈرائیور کوئی اور کام بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔

مشینی موزارت

فوری طور پر مصنوعی ذہانت اور روبوٹکس تمام صنعتوں کو یکسر ختم نہیں کر رہے۔ روزمرہ کی وہ سرگرمیاں، جن میں اسپیشلائزیشن درکار ہوتی ہے، فی الحال وہی آٹومیشن پر جائیں گی۔ تاہم وہاں انسانوں سے مشینوں میں تبدیلی کافی دشوار ہوگی، جہاں کام کی ایسی مختلف نوعیتیں پیش آئیں گی، جن کا تعلق غیر معین صورتحال اور فیصلہ سازی سے ہوگا۔ مثال کے طور پر شعبہ صحت کو لیجیے، زیادہ تر ڈاکٹر معمول کی معلومات پر ذمے داریاں ادا کرتے ہیں، میڈیکل ڈیٹا جمع کرتے ہیں، اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور علاج تجویز کرتے ہیں۔ جبکہ نرسوں کا کام حساس ہوتا ہے، انہیں احتیاط سے تکلیف دہ انجکشن لگانے ہوتے ہیں، مریض کی نفسیاتی و اخلاقی مدد بھی کرنی ہوتی ہے اور غصیلے مریض پر قابو بھی پانا ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ اسمارٹ فون پر خاندانی AI ڈاکٹر کا استعمال روبوٹک نرسوں سے دہائیوں پہلے شروع ہو جائے۔ انسانوں کی دیکھ بھال کا کام غالباً طویل عرصہ انسانوں ہی کے ذمے رہے گا۔ غالباً یہ انسانوں کی مزدور منڈی میں سب سے زیادہ فروغ پانے والا شعبہ قرار پائے۔

اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی سرگرمیوں والے کام بھی فوری طور پر آٹومیشن پر نہ لائے جا سکیں گے۔ ہمیں انسانوں سے موسیقی خریدنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ ہم آسانی سے ڈاؤن لوڈ کر لیتے ہیں، مگر موسیقار، گلوکار اور فنکار اب بھی گوشت پوست کے انسان ہی ہیں۔ ہمیں ان کی تخلیقی صلاحیتیں درکار ہوں گی۔

اس سب کے باوجود، کوئی بھی روزگار مکمل طور پر آٹومیشن سے محفوظ نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ فنکار بھی نوٹس پر چلے جائیں گے۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ موسیقی انسانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، مگر اس صورت میں کیا ہوگا جب خارجی لیلگورتھم انسانی جذبات سمجھنے لگیں گے، اور انہیں شیکسپیئر اور فریڈا کاہلو سے بہتر انداز میں پیش کریں گے؟

بہرحال، جذبات اب کوئی پراسرار شے نہیں رہے، یہ محض بائیوکیمیکل عمل ہے۔ بہت جلد مشینی لیلگورتھم سینسر کے ذریعہ ہمارے جسم کے بائیومیٹرک تجزیے کریں گے، پسند ناپسند اور موڈ کا پتا لگائیں گے اور اس کے مطابق مطلوبہ موسیقی سنوا دیں گے، پسند کا گیت اور سُر تک الگ نکال کر مہیا کر دیں گے۔

نئی نوکریاں؟

شعبہ صحت اور تفریح میں روزگار کی کمی کو جزوی طور پر نئی نوکریوں سے حل کیا جائے گا۔ جنرل میڈیکل پریکٹیشنرز، جو عموماً مریضوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، وہ شاید مصنوعی ذہانت کی جگہ سنبھال سکیں۔ انسانی ڈاکٹر، لیب اسسٹنٹ وغیرہ تحقیق اور نئی دواؤں کی تیاری سے کافی آمدنی پیدا کر سکیں گے۔ مصنوعی ذہانت شاید ایک اور طریقہ پر انسانی نوکریوں کا انتظام کر سکے، وہ یہ کہ انسان مصنوعی ذہانت سے مسابقت کے بجائے ان کی خدمات پر مامور ہو جائیں، ان کے معاون بن جائیں۔ مثال کے طور پر، ڈرون کی ایجاد نے انسانی پائلٹس کی نوکریاں ختم کیں، مگر ساتھ ہی مینٹیننس، ریموٹ کنٹرول، ڈیٹا کا تجزیہ، اور سائبر سکیورٹی جیسے شعبوں میں نئی اسامیاں پیدا کر دیں۔ امریکی فوج میں ایک ڈرون کنٹرول کرنے کے لیے '۳۰' آپریٹر کام کرتے ہیں اور جائزہ و نتائج کے لیے '۸۰' افراد مامور ہیں۔ اگر صورتحال اسی طرح رہی، تو ۲۰۵۰ء تک جاب مارکیٹ میں انسانوں اور مصنوعی ذہانت کے درمیان مقابلہ کی فضا شاید پیدا نہ ہو، بلکہ تعاون و اشتراک ہو۔ پولیس اور بینکاری کے شعبوں میں تعاون صرف انسانوں

اورصرف کمپیوٹر دونوں کو مات دے سکتا ہے۔تاہم ان سب نوکریوں کے ساتھ ایک مسئلہ درپیش رہے گا، وہ ہے انتہائی مہارت کا۔ روزگار کا حصول شاید پھر بھی اتنا مشکل نہ ہو، جتنا دشوار انسانوں کو ازسرنو تربیت دینا ہوگا۔ ماضی میں بھی آٹومیشن کی کئی لہریں آئیں، مگر ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں منتقل ہونا چنداں دشوار نہ تھا۔ مگر ۲۰۵۰ء میں ایک کیشیئر یا ٹیکسٹائل ورکر۔۔۔کینسر ریسرچر، ڈرون آپریٹر، یا آرٹیفیشل انٹیلی جنس ہینکنگ ٹیم کا حصہ نہیں بن سکے گا، اس کے لیے غیر معمولی مہارت درکار ہوگی۔

اس طرح، انسانوں کے لیے بہت سی نئی نوکریوں کے باوجود عمومی صورتحال خوفناک ہوگی، شاید ایک بہت بڑا 'بے کار' طبقہ وجود میں آجائے۔ غیر تربیت یافتہ ملازمین اور بے روزگاری دونوں مل کر شاید بڑا بحران پیدا کردیں۔ کوئی بھی انسانی روزگار آٹومیشن سے ہمیشہ کے لیے محفوظ نہیں رہے گا۔۔۔۲۰۵۰ء تک نہ صرف 'تاحیات روزگار'، بلکہ 'تاحیات پیشہ' کا تصور بھی بالکل دقیانوسی ہوچکا ہوگا۔ ایسی صورتحال میں انسانوں پر ذہنی تناؤ بڑھے گا، بے روزگاری اور بے کاری کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون کی ادویات کے استعمال میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ یقیناً ابھی، یعنی بہ وقت تحریر، یہ باتیں قیاس آرائیاں ہیں۔ آٹومیشن نے صنعتوں میں ہلچل ضرور پیدا کی ہے، مگر روزگار کا بحران پیدا نہیں ہوا۔ ابھی یہ کہنا انتہائی دشوار ہے کہ مشینیں کب تک انسانوں کی جگہ لے لیں گی۔ اس کا بہت کچھ انحصار سیاسی فیصلوں اور ثقافتی تبدیلیوں سے ہی سامنے آئے گا، خاص طور پر ٹیکنالوجی کی پیشرفت اس حوالے سے فیصلہ کن ہوگی۔ تاہم ہم خواب خرگوش کے مزے نہیں لے سکتے۔ یہ باور کرنا خطرناک ہوگا کہ روزگار کی کمی نئی نوکریوں سے پوری کرلی جائے گی۔ سیاسی اور سماجی انتشار اس قدر زیادہ ہے کہ سنجیدگی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اکیسویں صدی میں انفوٹیک اور بائیوٹیک سے پیدا ہونے والا چیلنج ماضی کے کسی بھی صنعتی چیلنج سے زیادہ بڑا اور ہولناک ہے۔ اب ہم مزید جنگوں اور خونیں انقلابات کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ اس بار ناکامی نیوکلیائی جنگ کی صورت میں سامنے آئے گی، جینیاتی انجینئرنگ سے نہ جانے کیسے کیسے عفریت سامنے آئیں گے۔ کرہ ارض پر زندگی مکمل طور پر خطرے میں پڑ جائے گی۔

استحصال سے لاتعلقی تک

روزگار کے بحران سے بچنے کے تین راستے نظر آتے ہیں۔ نوکریوں کے زیاں سے بچنا قابل عمل اور دانشمندی نہیں، کیونکہ روبوٹکس اور مصنوعی ذہانت کے فوائد سے ہاتھ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ حکومتیں شاید یہ کوشش کریں کہ آٹومیشن کے نفاذ کی رفتار سست رکھی جاسکے، تاکہ اچانک صدمات اور بھونچال سے بچا جاسکے۔ ٹیکنالوجی کبھی بھی جبر کی صورت نہیں بنی اور یہ کہ کچھ ہوسکتا ہے کہ مطلب یہ نہیں کہ وہ لازماً ہوگا ہی۔ یہ ممکن ہے کہ حکومتیں ٹیکنالوجی کا راستہ کامیابی سے روک سکیں اور اس سے ضروری کمرشل اور معاشی فائدے بھی سمیٹ سکیں۔ جیسے انسانی اعضا کی خرید وفروخت کا راستہ سرکاری سطح پر روکا گیا ہے، جبکہ یہ اربوں کھربوں کا کاروبار بن سکتا ہے۔ اگر تبدیلی کا عمل سست کردیا جائے، تو خاطر خواہ نوکریاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ مگر اس کے لیے بھی حکومتوں کو عمر بھر کی تعلیم کے لیے مکمل سہولیات کا انتظام کرنا ہوگا اور طویل عرصہ تک کے لیے سیفٹی نیٹ مہیا کرنا ہوگا، تاکہ لوگ ٹیکنالوجی میں مہارتیں حاصل کرسکیں۔

تاہم یہ واضح نہیں کہ لوگ ساری زندگی تیزی کے ساتھ پیشہ ورانہ تبدیلیاں برداشت کرپائیں گے یا نہیں۔ یقیناً ایک بہت بڑا طبقہ ایسا نہیں کرپائے گا۔ تو پھر بے روزگار و بے کار دنیا کیا کرے گی؟ اس کے لیے نئے معاشرتی نمونے ڈھونڈنے ہوں گے، یا تیار کرنے ہوں گے۔ مگر اس سے بھی پہلے دیانت داری سے اعتراف کرنا ہوگا کہ موجودہ معاشی و سیاسی نظام درپیش چیلنج سے نبرد آزما نہیں ہوسکتا۔

شاید کچھ لوگ کہیں کہ انسان کبھی بھی معاشی طور پر لاتعلق نہیں ہوسکتا، کیونکہ صارف تو وہی رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مستقبل میں انسانی صارفین کی ضرورت بھی شاید نہ رہے۔ روبوٹکس اور مصنوعی ذہانت کی اپنی دنیا اپنی ضروریات ہوں گی، وہ ایک دوسرے کے صارف بھی ہوسکتے ہیں۔ شاید انہیں اس بات کی ضرورت ہی نہ ہو کہ انسان ان سے کچھ خریدیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الگورتھم پہلے ہی تاجر اور بیوپاری بن چکے ہیں، آج اسٹاک ایکسچینج میں وہ بانڈز کے اہم خریدار ہیں۔ مثلاً اشتہار کی دنیا میں اس وقت سب سے بڑا خریدار گوگل سرچ انجن الگورتھم ہے۔ ظاہر ہے الگورتھم ہوش وحواس نہیں رکھتا، نہ جذبات رکھتا ہے، نہ خواہشات (یہاں ہراری تضاد کا شکار ہورہے ہیں، پہلے باب میں اور دیگر مقامات پر وہ انسانی احساسات اور جذبات کو مشینی قرار دیتے رہے ہیں، اب یہاں انہیں اعتراف ہے کہ مشین کے کوئی جذبات اور خواہشات نہیں ہوتیں)، اور نہ ہی آئس کریم کھاسکتا ہے، مگر آج کی دنیا میں بہترین آئس کریم کون سی ہے؟ اس کا فیصلہ گوگل رینکنگ کرتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی کتاب اشاعت کے لیے بھجواتا ہوں، تو ناشر کے ساتھ ساتھ ایلگورتھم کی مہارت درکار ہوتی ہے، جو زبان کی تصحیح کرتا ہے۔

بہرصورت ہمیں روزگار سے زیادہ انسانوں کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں انہیں لاتعلقی سے بچانا ہوگا، ایک ایسا معاشرتی نمونہ تیار کرنا ہوگا، جس میں بے روزگار دنیا کی جسمانی اور نفسیاتی بقا کا سامان وافر دستیاب ہوسکے۔ اگر ہم عالمی سطح پر نئے متحد انسانی معاشرے تشکیل دینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو مصنوعی ذہانت اور ایلگورتھم وغیرہ ہمارے لیے نعمت سے کم نہ ہوں گے۔ مگر یہ بات ہمارے لیے ہولناک ہوسکتی ہے کہ اختیارات سارے ایلگورتھم کے ہاتھوں میں چلے جائیں! اس طرح ڈیجیٹل ڈکٹیٹرشپ کا عروج ہوگا اور یہ لبرل کہانی کا افسوسناک اختتام ہوگا!

(کتاب: ''اکیسویں صدی کے اکیس سبق''۔ ترجمہ وتلخیص: ناصر فاروق)

●●●

بقیہ: بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے پر بھارت کے خدشات

اور تنازع علاقوں میں چین کی جانب سے انفرااسٹرکچر منصوبوں کی تعمیر بہت سے بھارتیوں کو بیجنگ سے مزید شاکی کردیتی ہے۔ بھارت چین کی جانب سے اپنے پڑوسی ممالک میں منصوبوں پر کام کرنے پر سخت پریشان ہے، کیوں کہ ان منصوبوں سے چین کو اہم حریف بھارت پر تزویراتی برتری حاصل ہوسکتی ہے۔ بھارت اور چین سرحدی کشیدگی کے تناظر میں بیجنگ کو بھارت کی علاقائی خودمختاری کا احترام کرنا چاہیے، تاکہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا مثبت تاثر ابھر سکے۔ بھارت کے پڑوس میں چین کی بڑھتی ہوئی تزویراتی موجودگی بیلٹ اینڈ روڈ منصوبوں کے خلاف نئی دہلی کی مزاحمت کو شدید بنا رہی ہے۔ بنگلادیش، نیپال اور میانمار سے زمینی راستوں اور سری لنکا اور مالدیپ سے سمندری راستوں کے ذریعے چین کے بڑھتے تعلقات پر بھارت کو شدید تحفظات ہیں۔ بحرہند چین کی میری ٹائم سلک روڈ اور بھارتی بحریہ کے لیے اہم ترین علاقہ ہے، بھارت کو سب سے زیادہ خدشات اس منصوبے پر ہی ہیں۔ نئی دہلی نے نا صرف اپنے پڑوس میں چین کی بڑھتی ہوئی موجودگی پر خدشات کا اظہار کرنا شروع کردیا ہے بلکہ وہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے پر بھی اپنا موقف بیان کررہا ہے۔(۔۔۔جاری ہے!)

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"India's answer to the belt and road: A road map for South Asia". ("carnegieindia.org".Aug. 21, 2018)

چاہ بہار بندرگاہ بھارت کے لیے استحکام یا خطرہ؟

Sudha Ramachandran

چاہ بہار میں بندرگاہ کے منصوبے پر بھارت نے ایران کے ساتھ مل کر کام کا آغاز کر دیا ہے، نئی دہلی نے درحقیقت وسطی ایشیا میں ایک اقتصادی اور تزویراتی سنگ میل عبور کیا ہے۔ چاہ بہار میں پہنچ کر بھارت اقتصادی لحاظ سے اہم آبنائے ہرمز تک پہنچ جائے گا اور یہ دنیا بھر میں تیل کی ترسیل کی ایک بڑی گزرگاہ ہے۔ چین اس علاقے میں پہلے سے موجود ہے اور آنے والے برسوں میں چین پاکستان کی بندرگاہ گوادر میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے۔ گوادر چین پاک اقتصادی راہداری کا مرکز ہے جہاں ۴۰ سال تک چین کی موجودگی یقینی ہے۔ چاہ بہار میں موجود بھارت صرف ۷۲ کلومیٹر کے فاصلے پر گوادر میں چین کی ہر سرگرمی پر گہری نظر رکھ سکتا ہے۔

چاہ بہار کی بندرگاہ پر سرمایہ کاری اور ترقیاتی کام ایران اور بھارت کے درمیان تعلقات کو مضبوط کرے گا۔ یہ بندرگاہ دنیا کی تیسری بڑی تیل مہیا کرنے والی بندرگاہ کے ساتھ ساتھ افغانستان کا اہم تجارتی اقتصادی راستہ بھی ہے۔ چاہ بہار کے ذریعے بھارت افغانستان میں تعمیری منصوبوں میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے، جو چاہ بہار کے بغیر ناممکن ہے۔ کیوں کہ پاکستان بھارت کو افغانستان تک پہنچنے کے لیے کبھی بھی اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

چاہ بہار کی بندرگاہ وسط ایشیائی ریاستوں اور بھارت کے درمیان تجارتی تعلقات کو مضبوط بنائے گی۔ اس وقت بھارت کی ان ریاستوں کے ساتھ کل تجارت محض ایک اعشاریہ پانچ ارب ڈالر ہے۔ چاہ بہار کا بین الاقوامی شمالی جنوبی ترسیلی راہداری کے ساتھ رابطہ ہونے کے بعد یہی بندرگاہ یوریشیا کی طرف سے بھارت کے لیے ایک گیٹ وے کا کام دے گی۔ ایک اندازے کے مطابق بھارت کی بین الاقوامی شمالی جنوبی ترسیلی راہداری کے ذریعے تجارت کا حجم ۷۰ ارب ڈالر تک پہنچ جائے گا۔

بھارت چاہ بہار پر ''شاہد بہشتی ٹرمینل'' کی تعمیر کر رہا ہے، جو کہ پانچ مرحلوں میں مکمل ہوگی۔ اس ٹرمینل کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد بندرگاہ کا سالانہ حجم ۸۲ میٹرک ٹن تک پہنچ جائے گا۔ چاہ بہار کی بندرگاہ کا انتظامی کنٹرول فی الحال تو ۱۸ ماہ تک بھارت کی سرکاری کمپنی ''انڈین پورٹ گلوبل لمیٹڈ'' کے پاس ہوگا۔ لیکن دونوں ممالک کی رضامندی سے یہ مدت ۱۰ سال کی لیز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

بھارت چاہ بہار میں برتھوں کی تعمیر کے لیے ۸۵٫۲۱ ملین کی سرمایہ کاری کر رہا ہے اور اپنی سالانہ آمدنی کا ۲۲٫۹۵ ڈالر چاہ بہار کے فیزون میں آلات کی مد میں بھی خرچ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت، ایران افغانستان سرحد کے قریب چاہ بہار سے زاہدان تک ۱٫۶ ارب ڈالر سے ریلوے لائن بچھا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت کی سرکاری اور غیر سرکاری کمپنیاں ''چاہ بہار فری ٹریڈ زون'' میں ۲۰ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔

چاہ بہار کا علاقہ اقتصادی اور تزویراتی اہمیت رکھتا ہے۔ خلیج عمان اور ایران کی مکران ساحلی پٹی پر واقع یہ بندرگاہ اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ بحر ہند تک ایران کو براہ راست راستہ فراہم کرتا ہے، اگر ایران کے دشمن آبنائے ہرمز کو ایران کے لیے بند بھی کرتے ہیں تو چاہ بہار آبنائے ہرمز سے تقریباً ۳۰۰ کلومیٹر دور ہونے کی وجہ سے ایران کے لیے مشرقی سمندری راستے کو کھلا رکھنے کا باعث بنے گا، اور اس طرح ایران بین الاقوامی دباؤ کا مقابلہ کر سکے گا۔

چاہ بہار بندرگاہ ایران کی گہرے سمندر میں پہلی بندرگاہ ہے۔ گہرے پانی کی بندرگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ایرانی کمپنیوں پر اس حوالے سے پابندیوں کا سامنا تھا۔ بندر عباس بندرگاہ پر ایک لاکھ ٹن وزن اٹھانے والے جہازوں کی گنجائش ہے، یہاں پانی کی سطح بھی کم ہے۔ ایک لاکھ ٹن سے زیادہ کے لیے ایران دبئی کی بندرگاہ پر انحصار کرتا تھا۔ وہاں وہ جہاز اپنا سامان چھوٹے جہازوں پر منتقل کرتے تھے تو اس سامان کی ترسیل بندر عباس کی بندرگاہ پر ہوتی تھی۔ چاہ بہار کی بندرگاہ کھلنے کے بعد ایران کا دبئی پر انحصار بھی ختم ہو جائے گا اور لاکھوں ڈالر فیس کی مد میں بھی بچا سکے گا۔

چاہ بہار کی بندرگاہ افغانستان کا سمندر تک پہنچنے کے لیے پاکستان پر سے انحصار بھی ختم کر دے گی۔ یہاں سے افغانستان ترکی، روس، بالٹک ریاستوں سمیت چین اور ایران تک بھی آسانی سے پہنچ سکے گا۔ چاہ بہار کے ذریعے بحری راستے کی تجارت کے لیے مختصر راستے کھل جائیں گے۔

بھارت کا تجارتی سامان چاہ بہار پر اترے گا، وہاں سے یہ ٹرین اور ٹرک کے ذریعے افغانستان کے مختلف شہروں میں پہنچے گا، رنگ روڈ کے ذریعے سامان تجارت افغانستان کے ہر شہر میں پہنچ سکے گا۔ تجارتی سامان افغانستان سے وسط ایشیائی ریاستوں میں اور پھر وہاں سے افغانستان با آسانی منتقل ہو سکے گا۔ وسط ایشیائی ریاستوں سے آنے والا سامان ایران کے ریلوے ٹریک کے ذریعے زاہدان سے ہوتا ہوا چاہ بہار پہنچے گا اور وہاں سے کشتیوں کے ذریعے بھارت اور دوسرے ممالک روانہ کیا جائے گا۔

۲۰۱۳ء میں پہلی بار ایران نے بھارت کو اپنے چاہ بہار بندرگاہ کے منصوبے میں شامل کیا ہے، اس منصوبے کو شروع کرنے میں کافی وقت لگا ہے۔ مغرب نے ایران پر جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کی وجہ سے بھارت شکوک و شبہات کا شکار تھا اس کے علاوہ وہ منصوبے کی سست روی پر بھی اپنے تحفظات کا اظہار کر رہا تھا یہاں تک کہ کچھ مہینے پہلے ایران پر امریکا کی سخت ترین پابندیوں کے باعث یہ منصوبہ مکمل طور پر رک چکا تھا۔ لیکن نومبر میں ٹرمپ نے چاہ بہار اور افغان ریلوے لائن منصوبے پر سے پابندی کو ختم کیا، اس کے بعد دوبارہ ایران نے اس منصوبے پر کام شروع کیا۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر گلشن شادیو نے سفارت کاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ اس منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے اس سال بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اس میں ایران اور امریکا کے درمیان اختلافات اور افغانستان میں سیکورٹی جیسے اہم مسئلے شامل ہیں۔

دوسری طرف طویل زمینی فاصلے پر تجارت اور معاشی استحکام پر ابھی بھی سوالات اٹھ رہے ہیں۔ ٹرین کے ذریعے جانے والا سامان کشتی کی بہ نسبت جانے والے سامان سے کم وقت میں منزل تک پہنتا ہے بلکہ کبھی کبھی سمندری راستہ ٹرین کی نسبت دوگنا وقت لیتا ہے، اس منصوبے کا اصل مقصد طویل فاصلہ کم وقت میں طے کرنا ہے اور اسی مقصد کا حصول چاہ بہار منصوبے کو کارآمد بنائے گا۔

ابھی یہ بحث باقی ہے کہ اقتصادی راہداری افغانستان کے لیے چاہ بہار سے زاہدان کا راستہ زیادہ مناسب ہے یا ایشیا کے لیے بھارت براستہ وسط ایشیائی ریاستیں زیادہ

مناسب ہے۔ پروفیسر شادیو کے مطابق اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار معاشی استحکام پر ہے۔

چاہ بہار کا مستقبل یہ ہے کہ تجارتی سامان کی روزانہ کی بنیاد پر مسلسل ترسیل اور حجم طے کرلیا جائے۔اس وقت بھارت صرف افغانستان سے تجارت پر زور دے رہا ہے، جو کہ راہداری کے استحکام کے لیے ناکافی ہے۔ دوسرے ممالک جیسے خلیج تعاون کونسل کے ارکان ممالک اور وسط ایشیائی ممالک کی بھی اسی راستے تجارتی ترسیل اس راہداری کی ضرورت ہے۔صرف افغانستان سے تجارت کافی نہیں، دوسری طرف ایران کے خلیج تعاون کونسل کے ارکان ممالک سے اختلافات انہیں چاہ بہار کی طرف راغب نہیں کرسکیں گے۔

خطے میں ممالک کے درمیان رابطے اور تعلقات بڑھانا اس منصوبے کی اصل کامیابی ہے،لیکن معاشی خسارے کی وجہ سے چاہ بہار اور زاہدان کے ریلوے لائن کا منصوبہ ابھی تک قابل عمل نہیں بن سکا ہے، جب کہ تاحال بین الاقوامی جنوبی شمالی راہداری بھی بند ہے۔

چین اس منصوبے پر ایک خاص اثر ڈال سکتا تھا،لیکن وہ پہلے سے ہی گوادر میں بندرگاہ کی تعمیر اور انتظام میں مصروف ہے۔مبصرین کے مطابق مستقبل میں یہی بندرگاہ چاہ بہار کا مقابلہ کرے گی، آنے والا وقت یہ بتائے گا کون سی بندرگاہ زیادہ منافع بخش ہے۔گوادر نہ صرف چاہ بہار سے بڑا منصوبہ ہے بلکہ چین اس پر بڑی تیزی سے سرمایہ کاری بھی کررہا ہے اور اسی تیزی سے ''سی پیک'' میں شامل گوادر سے کاشغر کے لیے ریلوے ٹریک بھی تعمیر کررہا ہے۔اس حوالے سے گوادر چاہ بہار سے کہیں زیادہ منافع بخش بندرگاہ بنے گی اور دنیا بھر کے تاجروں کو اپنی طرف راغب کرسکے گی۔

پروفیسر شادیو کے مطابق چین چاہ بہار میں بھی شراکت داری کرسکتا ہے،ایران نے اس بات کا اظہار کئی بار کیا ہے کہ وہ چاہ بہار کے منصوبے میں پاکستان اور چین سمیت کئی دوسرے ممالک کو بھی شامل کرسکتا ہے۔

پالیسی سازوں اور تجزیہ کاروں کے مطابق بھارت کو چین کی شمولیت اور ایران سے چین کے بڑھتے تعلقات پر اعتراض ہوسکتا ہے،خصوصاً جب سے چین اور ایران کے معاشی اور عسکری تعلقات مضبوط ہوئے ہیں تب سے اس طرح کے خدشات ظاہر ہوئے ہیں۔پروفیسر شادیو کے مطابق چاہ بہار میں چین کی شمولیت اس منصوبے کو دوام بخشے گی اور چین کی شراکت سے چاہ بہار اور گوادر کے درمیان ہم آہنگی بھی پیدا ہوگی۔

ایران اس معاملے کو بھارت سے زیادہ سمجھتا ہے۔ ایران کو اس بات کا علم ہے کہ چین نہ صرف چاہ بہار بندرگاہ کے ساحلوں کو اپنے قبضے میں رکھے گا بلکہ اس پر سرمایہ کاری کرے گا اور اس کے بنیادی ڈھانچے پر بھی خرچ کرے گا، لیکن اپنی خودمختاری مقدم رکھنے والے ملک ایران کے لیے یہ سب برداشت کرنا ذرا مشکل ہوگا۔

چین کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ چاہ بہار پر برتھوں کا کنٹرول اپنے پاس رکھنے کا خواہاں ہے،لیکن چوں کہ فی الحال گوادر کا مکمل کنٹرول چین کے پاس ہے، اس لیے اسے چاہ بہار کا کنٹرول حاصل کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔

وقتی طور پر چین کی چاہ بہار میں شمولیت کی وجہ صرف اور صرف بھارت کو منہ دکھانا ہوسکتی ہے، نہ کہ کسی تزویراتی مفاد کا حصول۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

"India doubles down on Chabahar gambit".
("thediplomat.com". January 14, 2019)

سوشل میڈیا: ''تیز تر'' سے ''سست تر'' کی جانب

Leo Mirani

موجودہ دور میں سوشل میڈیا تیز سے تیز تر ہوچکا ہے۔ اس کا ثبوت ہمارے موبائل فون ہیں، جو ہر لمحے کسی نئے پیغام یا ٹویٹ کے آنے سے بجتے رہتے ہیں۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب وقت بدلنے والا ہے۔جس طرح فاسٹ فوڈ کی مقبولیت نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ''سلوفوڈ'' (Slow Food) مہم کا آغاز کیا اور ۲۰۰۰ء کی دہائی میں ریئلٹی ٹی وی پروگرامات کی بھرمار نے ''سلوٹی وی'' (Slow TV) کی شروعات میں اہم کردار ادا کیا۔اس طرح اب یہ خیال جارہا ہے کہ ۲۰۱۹ء میں ''سلوسوشل'' (Slow Social) یعنی نسبتاً سست سوشل میڈیا کو فروغ ملے گا۔اس تبدیلی کا آغاز بھی ہوچکا ہے۔سماجی رابطے کے ادارے جو ماضی میں اپنی خدمات کو آسان اور تیز تر بنانے پر توجہ دیتے تھے اب اپنے اس رویے میں تبدیلی لارہے ہیں۔

گزشتہ سال جولائی میں واٹس ایپ نے یہ پابندی عائد کردی کہ کوئی بھی پیغام ایک وقت میں پانچ سے زائد افراد کو نہیں بھیجا جاسکتا۔انسٹاگرام نے بھی ایک ایسی خصوصیت متعارف کروائی ہے، جس میں تمام نئی تصاویر دیکھنے کے بعد صارفین کو یہ پیغام موصول ہوتا ہے کہ اب وہ تمام نئی تصاویر دیکھ چکے ہیں۔اس پیغام کا مقصد یہ ہے کہ صارفین اب اپنا وقت دیگر سرگرمیوں میں صرف کریں۔اسی طرح فیس بک نے بھی ایک خصوصیت متعارف کروائی جس سے صارفین یہ جان سکیں گے کہ وہ سوشل میڈیا پر کتنا وقت صرف کررہے ہیں۔گزشتہ سال ستمبر میں ٹویٹر نے اعلان کیا تھا کہ وہ صارفین کو پرانی ٹائم لائن پر جانے کی اجازت دے گا۔پرانی ٹائم لائن پر ٹوئٹس نئی ٹائم لائن کے برعکس سادہ انداز میں نظر آتی تھیں۔

ٹویٹر کی نئی ٹائم لائن اور واٹس ایپ پر پیغامات بھیجنے کے آسان طریقے نے خبروں کو بہت تیزی سے پھیلانے (وائرل کرنے) میں اہم کردار ادا کیا۔اس کے بہت بھیانک نتائج سامنے آئے۔گزشتہ سال بھارت میں پُرتشدد واقعات کی ایک لہر چل پڑی تھی۔ان واقعات کی وجہ واٹس ایپ پر وائرل ہونے والی افواہیں تھیں۔ان واقعات کے بعد سوشل میڈیا پر خبروں کو بے لگام طریقے سے پھیلنے سے روکنے کے لیے اقدامات شروع ہوئے۔

فیس بک جیسی سماجی رابطے کی بڑی کمپنی، جس کی ملکیت میں انسٹاگرام اور واٹس ایپ بھی ہیں کی اب یہ خواہش ہے کہ صارفین سوشل میڈیا کا استعمال شعوری، مثبت اور متاثر کن انداز میں کریں۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سماجی رابطے کے ادارے بھی سوشل میڈیا کے منفی اثرات کو تسلیم کرچکے ہیں اور اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ صارفین اِن منفی اثرات کے باعث سوشل میڈیا کو ترک کرنے کے بجائے اس کا مثبت استعمال سیکھیں۔

سماجی رابطے کے اداروں کی جانب سے متعارف کی گئی مذکورہ بالا خصوصیات اس بات کا اشارہ ہیں کہ یہ ادارے ٹیکنالوجی کے تیز رفتار سفر کو شعوری طور پر سست کرنا چاہ رہے ہیں۔سال ۲۰۱۹ء میں اس حوالے سے مزید اقدامات متوقع ہیں۔ (ترجمہ: محمد عمید فاروقی)

"Slow Social: The World in 2019".
("Economist". Special Edition)

●●●

ٹیکنالوجی کی ترقی سے ہوشیار رہیے۔۔۔

Laurie Seagall

ٹیکنالوجی ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ ٹیکنالوجی خیر پر مبنی چیز ہے۔ان کا خیال ہے کہ معلومات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اس کو محدود نہیں رکھا جائے۔معلومات کا تبادلہ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی بہتر ہے۔جن کمپنیوں نے دنیا کو باہم جوڑنے کا دعویٰ کیا تھا ان سے بھی یہی توقع کی گئی تھی کہ وہ معلومات کے تبادلے میں معاونت فراہم کریں گی۔سلی کون ویلی کی بنیاد میں بھی یہی خیال پوشیدہ تھا۔

گزشتہ کچھ عرصے میں ٹیکنالوجی کی دنیا میں کئی انقلابات برپا ہوئے۔ایپل نے اسمارٹ فون کو مقبول عام بنایا،فیس بک نے ۲؍ارب سے زیادہ افراد کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا،گوگل کے ذریعے کم وبیش ہر سوال کا جواب میسر ہے۔اس کے علاوہ ایمازون،نیٹ فلکس اور اُوبر جیسی کمپنیوں نے خود کو عوام کی کثیر تعداد کے لیے ناگزیر بنالیا ہے۔

ان تبدیلیوں کے کچھ غیر مطلوبہ نتائج بھی ظاہر ہوئے۔ لاکھوں صارفین کی شناخت اور ڈیٹا،ہیکرز کے ہاتھوں چوری ہوا۔سوشل میڈیا کو انارکی پھیلانے اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا۔اس کے علاوہ مصنوعی ذہانت اور چہرہ شناسی کی ٹیکنالوجی کے حوالے سے بھی کئی خدشات اور خطرات موجود ہیں۔

ٹیکنالوجی میں جدت آنے کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی سر اٹھا رہا ہے کہ آخر ہمارا اور آنے والی نسلوں کا مستقبل کیسا ہوگا اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسانی جذبات پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے۔

ٹیکنالوجی ماہرین نے پالیسی ساز افراد،تعلیمی ماہرین اور صارفین کے ساتھ مل کر ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوششوں کا آغاز کردیا ہے۔اُن ہی میں سے کچھ افراد سے ہم نے مستقبل کے چیلنجوں کے بارے میں دریافت کیا۔

چہرہ شناسی کی ٹیکنالوجی

چہرہ شناسی کی ٹیکنالوجی ہر گزرتے دن کے ساتھ انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا کررہی ہے۔تاہم اس ٹیکنالوجی کے کچھ نقصانات بھی نظر آرہے ہیں۔اب تک حکومتیں اس ٹیکنالوجی کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹیکنالوجی میں جدت آنے کے ساتھ ساتھ عوام کے جمہوری حقوق کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی جائے۔ ہمارا مستقبل ایسا ہونا چاہیے جس میں کمپنیوں کو معاشرتی ذمہ داریوں اور کاروبار میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب نہ کرنا پڑے۔(بریڈ اسمتھ،صدر مائیکروسافٹ)

ذہنی عدم مساوات

اب تک ہم دنیا میں کاروبار اور معاش کے شعبوں میں عدم مساوات کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ آنے والے وقت میں ذہنی عدم مساوات بھی ایک چیلنج بن جائے۔ ذہنی عدم مساوات کا مطلب ہے کہ لوگ اپنے دماغ میں چپ نصب کروا کر سوچنے کی صلاحیت کو بڑھالیں گے اور دوسروں سے زیادہ ذہین ہو جائیں گے۔اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے خیالات میں تبدیلی واقع ہونے کا خدشہ بھی موجود ہے۔نیورو سائنس دان اب اس قابل ہو چکے ہیں کہ وہ مصنوعی طریقے سے انسانی دماغ میں خیالات داخل کرسکیں۔سوال یہ ہے کہ کیا ہم خود سوچے گئے خیالات اور مصنوعی خیالات میں فرق کر سکیں گے؟(مورن سرف،نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی)

نئی نسل کی حفاظت

انسانی معاشرے کی ترقی اور بہبود کا دارومدار افراد کے مابین سماجی تعلقات پر ہوتا ہے۔حالیہ تحقیقات میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ جب والدین اپنی توجہ کمسن بچوں سے ہٹا کر اپنے فون پر مرکوز کرتے ہیں تو دراصل وہ ان سماجی تعلقات کو نقصان پہنچا رہے ہوتے ہیں۔والدین کے اس عمل کا بچوں پر منفی اثر ہوتا ہے۔ہم دیکھ رہے ہیں کہ بچے معاشرتی طور پر مکمل ہم آہنگ نہیں ہو رہے ہیں۔اس کے علاوہ پری پرائمری سے آٹھویں جماعت کے اساتذہ کا کہنا ہے کہ بچوں میں بڑھتا ہوا ذہنی اور جذباتی دباؤ اس وقت ان کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ان دونوں مسائل کی اصل وجہ اسمارٹ فون متعارف ہونے کے بعد معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں ہیں۔(کیتھی ہرش پاسیک،جوشوا اسپیرو)

محفوظ اسپتال

میں نے ایک رضا کارانہ پروگرام شروع کیا ہے جس کا مقصد اسپتالوں کی سائبر سیکورٹی کی جانچ پڑتال کرکے انسانی زندگیوں کا تحفظ کرنا ہے۔ہم نے اسپتالوں کی نقل (Simulation) تیار کی اور پھر ہیکنگ کے ذریعے جان بچانے والے آلات کو بند کردیا اور مریضوں کے ریکارڈ میں خطرناک تبدیلیاں کیں۔ ظاہر ہے یہ سب ہم حقیقت میں نہیں کررہے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔آج کل ڈاکٹر ٹیکنالوجی اور مشینوں پر مکمل بھروسا رکھتے ہیں لیکن یہ سہولیات کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہیں۔(جوشوا کورمین،سائبر سیکورٹی ماہر)

(ترجمہ وتلخیص:محمد عمید فاروقی)

"Be very afraid what tech world should fear next". ("Time Magazine ". January 28, 2019)

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ گزارش ہے کہ جب آپ کا پتا تبدیل ہوجائے تو براہِ کرم ہمیں اس کی تحریری اطلاع مع نیا پتا بلا تاخیر بھیج دیا کریں' تاکہ پچھلے پتے پر جا کر پرچہ ضائع نہ ہو۔اگر ہمارا لکھا ہوا پتا ادھورا یا غلط نظر آئے تو تصحیح میں ہماری مدد فرمائیں۔

۲۔ کسی صاحب کو''معارف فیچر'' ان کی خواہش کے بغیر جاری ہوگیا ہو یا اب اِسے لینا پسند نہ ہو تو گزارش ہے کہ براہِ کرم ہمیں اس کی اطلاع دینے کی زحمت ضرور کریں تاکہ پرچے کی ترسیل بند کی جاسکے۔

۳۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ''معارف فیچر'' جاری ہوجانے کے بعد از خود بند نہیں کیا جاتا۔اگر آپ میں سے کسی صاحب/ صاحبہ کو پرچہ بذریعہ ڈاک ایک بار بھی ملا ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ بعد میں بھی ان شاءاللہ ملتا رہے گا' تاآنکہ وہ خود منع کردیں۔اگر پرچہ ملنا رُک گیا ہو تو اس کا سبب ترسیل کا بند ہونا نہیں' کچھ اور ہوسکتا ہے۔مثلاً ڈاک والوں کی مہربانی یا پتا تبدیل ہوجانا۔لہٰذا''معارف فیچر'' بذریعہ ڈاک وصول کرنے والے اصحاب سے یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے بند ہونے کی فوری تحریری اطلاع مع اپنے پورے نام اور مکمل و درست پتے کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں۔۔۔ہم آپ کے تعاون' دعاؤں' مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔(مدیر)

نوٹ:۔ زرِتعاون اور عطیات کے چیک/ ڈرافٹ وغیرہ پر

Islamic Research Academy Karachi

لکھیے/لکھوایئے۔براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:

D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

شمالی افریقا میں اسلامی تحریکیں

قسط اوّل

مراکش، مصر اور تیونس کا تقابلی مطالعہ

عادل عبدالغفار اور بل ہمز

تعارف:

مراکش کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (PJD) کے راہنما سعد الدین العثمانی نے مارچ ۲۰۱۷ء میں اتحادی حکومت کے قیام کا اعلان کر کے پانچ سال سے جاری سیاسی بحران کا خاتمہ کر دیا۔ سعدالدین کی کاوشوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ ان کی جماعت PJD، جس نے ۲۰۱۶ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی، آئندہ بھی حکومت بنائے گی۔ یاد رہے کہ ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد سے مراکش کی حکومت اسی جماعت کے پاس ہے۔ PJD ۲۰۱۱ء میں اقتدار حاصل کرنے والی واحد اسلامی تنظیم نہیں تھی۔ عرب بہار کے نتیجے میں پورے شمالی افریقا میں حزب اختلاف کی جماعتوں کو نا قابل یقین مقبولیت حاصل ہوئی اور اس مقبولیت کے ذریعے یہ تنظیمیں اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔ حزب اختلاف کے جماعتوں میں سے **اسلامی تحریکوں** نے اس صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسی کے نتیجے میں اخوان المسلمون کے سیاسی ونگ فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی (FJP) اور النہضہ نے بھی بالترتیب مصر اور تیونس کے عام انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

ان کامیابیوں کے سات سال بعد مراکش کی PJD وہ واحد جماعت تھی جو قومی انتخابات میں فتح کے تسلسل کو برقرار رکھ سکی۔ تیونس اور مصر میں سیاسی مخالفین اور عوام کی کثیر تعداد کو یہ محسوس ہونے لگا کہ مقبولیت حاصل کرتی ہوئی اسلام پسند جماعتیں نہ صرف آمرانہ طرز جمہوریت کو فروغ دیں گی، بلکہ سخت اسلامی قوانین بھی نافذ کرنے کی کوشش کریں گی۔ جس کے نتیجے میں النہضہ اور اخوان کی FJP کی اپنے حریفوں سے مڈبھیڑ ہوگئی اور انھیں عوام کی طرف سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث ۲۰۱۴ء کے آغاز ہی میں النہضہ نے اقتدار ٹیکنو کریٹ حکومت کے حوالے کر دیا۔ بعد میں النہضہ کو پارلیمانی انتخاب میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی، لیکن وہ ہمیشہ جیتنے والی جماعت کے ساتھ اقتدار میں شریک رہی۔ FJP نے ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد نہ صرف صدارت حاصل کی، بلکہ ۲۰۱۲ء میں نئے آئین کے لیے بھی بھرپور کوششیں شروع کر دیں، جس کے نتیجے میں فوج نے صدر محمد مرسی کو اقتدار سے بے دخل کر کے اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن کا آغاز کر دیا، جو تا حال جاری ہے۔

FJP سے اقتدار چھن جانے کے بعد عرب دنیا میں موجود اسلامی تحریکوں کو شدید جھٹکا لگا، لیکن ان کے وجود کو مٹایا نہ جا سکا۔ عرب معاشروں میں اسلامی تحریکوں کے اثرات بہت گہرے ہیں، اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ سیاسی طور پر فعال بھی رہیں گی اور ان کا اثر و رسوخ بھی کسی حد تک قائم رہے گا۔ اس لیے یہ بات سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ جب بھی ان تحریکوں کو اقتدار حاصل ہوگا تو یہ کیسا برتاؤ کریں گی۔ مذکورہ تجزیے میں مراکش کی PJD، تیونس کی النہضہ اور مصر کی FJP کا تقابلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس جائزے میں مذکورہ جماعتوں کے پہلی مرتبہ اقتدار کے تجربات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے موجودہ طریقے سے حکومت کرنے میں کامیابی اور ناکامی کے اسباب پر غور کیا گیا ہے۔ مصنفین کی رائے کے مطابق PJD اور النہضہ کے لچک دارانہ اور حقیقت پسندانہ طرز عمل اور دیگر سیاسی طاقتوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر رضامندی نے انھیں سال ۲۰۱۱ء کے بعد کے سیاسی منظر نامے میں زندہ رکھا۔ اس کے برعکس FJP نے تنہا ہی مصر کے سیاسی نظام کو یکسر تبدیل کرنے کی کوشش میں نہ صرف تیزی دکھائی بلکہ انتہائی جارحانہ رویہ بھی اختیار کیا۔ نتیجتاً اخوان المسلمون کو اس سیاسی نظام سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس سارے عمل میں مجموعی قومی منظر نامے، بڑے پیمانے پر ہونے والی سیاسی تبدیلیاں اور پہلے سے موجود مسائل نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ اس تجزیے میں ''اسلام اور جمہوریت'' کے ملاپ پر بحث مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے اس بات پر غور کیا گیا ہے کہ اگر اسلامی تحریکوں کو حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے تو ان سے کس رویے کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

سال ۲۰۰۵ء میں ''کارنیگی ایڈومنٹ فار انٹرنیشنل پیس'' نے ایک مقالہ شائع کیا، جس میں اسلامی تحریکوں کے برسر اقتدار آنے کے نتیجے میں اسلامی قوانین، خواتین کے حقوق، اکثریت کی رائے، شہری حقوق اور اقلیتوں کے حقوق پر ان کے مبہم طرز عمل پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔

۲۰۱۱ء کے عرب بہار کے بعد تین اسلامی تنظیموں (PJD، FJP، النہضہ) کے پہلی مرتبہ برسر اقتدار آنے کے نتیجے میں مندرجہ بالا شعبہ جات میں اسلامی تنظیموں کے ردعمل کے بارے میں بے پناہ شواہد حاصل ہوئے۔ ان شواہد کی بنیاد پر اسلامی تحریکوں کے برتاؤ پر از سر نو بحث کی جا سکتی ہے۔

اس رپورٹ کے آغاز میں اسلامی تحریکوں کے بنیادی نظریات، تاریخ، عرب بہار سے قبل کا طرز سیاست، ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں حصہ لینے اور بعد ازاں ان کو ملنے والی کامیابیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں دو درجن سے زائد افراد کا انٹرویو لیا گیا۔ ان افراد میں سیکولر اور اسلامی تحریکوں سے وابستہ متحرک شخصیات اور سیاست دان شامل ہیں۔ اس رپورٹ کے اختتام پر النہضہ اور PJD کی مستقبل کی حکمت عملی پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی اور عالمی طاقتوں کو اسلامی تحریکوں سے تعمیری تعلقات استوار کرنے کے حوالے سے تجاویز دی گئیں ہیں۔

پس منظر:

مراکش، تیونس اور مصر سمیت دنیا بھر کی تحاریک اسلامی ''دعوت و تبلیغ'' اور ''سماجی کاموں'' کو معاشروں کے ساتھ جڑے رہنے اور ان ممالک میں اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دینے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ یہ تمام تحریکیں اس امید کے ساتھ کام کرتی ہیں کہ ان کے ممالک میں اسلامی نظام قائم ہو۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان تحریکوں نے سیاسی طور پر متحرک ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان تنظیموں کو آنے والے وقت میں سیاسی اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی تو پارلیمان میں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو کبھی انھیں پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایسے موقعوں پر ان تنظیموں نے کبھی حکومتوں کے ساتھ مفاہمت و معاونت کی حکمت عملی اختیار کی تو کبھی مخالفت کے راستے کو اپنایا۔

مصر اور اخوان المسلمون:

ان میں سب سے معروف تنظیم ''اخوان المسلمون'' ہے، جس کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں حسن البناء (شہید) نے رکھی۔ گزشتہ آٹھ دہائیوں میں اخوان اور ریاست کے مابین تعلقات اتار چڑھاؤ کا شکار رہے ہیں۔ اخوان مصر پر برطانوی قبضے کے خلاف تحریک کا حصہ تھی۔ اس تحریک میں اخوان نے جمال عبد

الناصر کی قیادت میں قائم Free Officer Movement کے ساتھ بھی کام کیا۔ ۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق کا تختہ الٹے جانے کے بعد اخوان نے ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے نے اخوان اور جمال عبد الناصر کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ نتیجتاً جمال عبد الناصر نے ۱۹۵۴ء میں اخوان پر پابندی عائد کردی۔ اسی سال جمال عبد الناصر نے مصر کی صدارت سنبھالی جس کے بعد اخوان کے ایک کارکن نے جمال پر قاتلانہ حملہ کیا، جس کے جواب میں جمال نے اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن کا آغاز کر دیا۔ اس کریک ڈاؤن میں اخوان کے بہت سے رہنماؤں کو قتل کر دیا گیا اور ہزاروں کارکنوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔ یہ کریک ڈاؤن ۱۹۷۰ء میں جمال کی موت تک جاری رہا۔

جمال ناصر کے بعد انور سادات نے اقتدار سنبھالا۔ انور سادات نے جمال ناصر کے حامیوں اور سوشلسٹوں سے مقابلے کے لیے اخوان کے کارکنان کو جیلوں سے رہا کر دیا اور انھیں کام کرنے کی کھلی آزادی دی، لیکن ۱۹۷۷ء میں انور سادات کے یروشلم کے دورے اور اس میں ہونے والے امن معاہدے نے اخوان اور سادات کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ پھر ۱۹۸۱ء میں انور سادات کو قتل کر دیا گیا۔ حسنی مبارک نے بھی حکومت میں آنے کے بعد اخوان سے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور اس کے بہت سے کارکنان کو رہا کر دیا جس کے نتیجے میں اخوان دوبارہ تیزی سے متحرک ہو گئی۔ اور ۱۹۹۰ء تک سرکاری اداروں میں اس کی رسائی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد اخوان نے روایتی سیاسی طاقت کے حصول کے لیے بھی کوششیں تیز کر دیں۔ اخوان نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۴ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان انتخاب میں اس نے ۴۵۴ نشستوں میں سے ۸ نشستیں حاصل کیں۔ ۱۹۸۷ء کے انتخابات میں اخوان نے دو مذہبی تنظیموں کے ساتھ اتحاد کیا۔ اس اتحاد نے ۶۰ نشستوں پر کامیابی حاصل کی، جس میں سے اخوان کے حصے میں ۳۶ نشستیں آئیں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں اخوان سیاسی طور پر زوال کا شکار ہو گئی۔ حسنی مبارک کی جانب سے پارلیمان تحلیل کیے جانے پر احتجاج کرتے ہوئے اخوان نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۹۵ء کے انتخابات میں اخوان نے جبر کے دور میں ایک نشست پر کامیابی حاصل کی جب کہ اس کے ۱۵۰ نمائندوں نے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ اس کمزور سیاسی صورت حال کے اسباب میں جہاں مبارک حکومت کا کریک ڈاؤن شامل تھا وہیں اخوان کے اندرونی اختلافات بھی اس کا محرک تھے۔

Carrie Rosefsky Wickham کا کہنا ہے کہ اخوان چوں کہ کسی خاص مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل نہیں تھی اس لیے اس دور میں تنظیم میں بڑے پیمانے پر نظریاتی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس نظریاتی کشمکش کی بڑی وجہ تنظیم کی شناخت کے بارے میں تھی۔ کچھ افراد اسے خالص دعوتی تحریک کے طور پر لے کر چلنا چاہتے تھے جب کہ کچھ افراد کی نظر میں اخوان کو سیاسی محاذ بھی سنبھالنا چاہیے تھا۔ نوے کی دہائی کے وسط میں اخوان کے کارکنان کی نئی نسل اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ ہمیں سیاسی جدوجہد میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اخوان کے کارکنان کی نئی نسل اپنے موقف میں لچک پیدا کرتے ہوئے خالصتاً اسلامی ریاست کے بجائے ایک ایسی ریاست کے لیے رضامندی کا اظہار کرنے لگی جو مکمل طور پر تو اسلامی نہ ہو لیکن وہاں اسلامی قوانین کا سہارا ضرور لیا جائے۔ چند افراد نے تو اخوان کے خاص سیاسی ونگ کے قیام کی تجویز بھی دی جسے راہنماؤں نے مسترد کر دیا۔ تجویز مسترد ہونے کے بعد ان لوگوں نے اخوان سے علاحدگی اختیار کر کے ایک الگ جماعت ''حزب الوسط'' بنانے کا اعلان کر دیا۔

حسنی مبارک کے دور میں اخوان کے سینئر رہنماؤں، جنھوں نے جمال ناصر اور سادات دور کے ظلم کا سامنا کیا تھا، دفاعی حکمت عملی اختیار کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک ہم سیاسی طور پر مضبوط نہ ہو جائیں ہمیں اس معاشرے کی مذہبی بنیادوں کو مضبوط کرنے پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ تاہم اس عرصے میں بھی اخوان انتخابی سیاست میں حصہ لیتی رہی۔ ۲۰۰۰ء کے انتخابات میں آزاد امیدواروں کی حیثیت سے اخوان کے ۱۷ افراد پارلیمان میں پہنچے۔ ۲۰۰۴ء کے بعد مہدی عاکف کی قیادت میں اخوان نے اپنی توجہ اور وسائل کا رخ پارلیمانی سیاست کی طرف موڑ دیا۔ ۲۰۰۵ء میں نسبتاً آزاد سیاسی ماحول میں اخوان نے پارلیمان کی ۲۰ فی صد یعنی ۸۸ نشستیں حاصل کیں۔ یہ ۲۰۱۱ء سے پہلے کے عرصے میں اخوان کی سب سے بڑی انتخابی کامیابی تھی۔

مراکش کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (PJD):

اخوان سے متاثر ہو کر مشرق وسطیٰ میں بہت سی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ جن میں PJD اور النہضہ بھی شامل ہیں۔ مراکش میں ۷۰ء کی دہائی میں Islamic Youth Association کے نام سے ایک عسکری تنظیم بنائی گئی لیکن ریاست کی سخت مخالفت کی وجہ سے اس تنظیم پر ۱۹۷۶ء میں پابندی لگا دی گئی، جس کے بعد یہ تنظیم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ اسی تنظیم کے سابق ارکان جن میں ''بن کیران'' بھی شامل تھے، انھوں نے مل کر ۱۹۸۱ء میں اسلامک گروپ کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم نے آغاز ہی سے ''ریاست کے ساتھ مفاہمت'' کی حکمت عملی اختیار کی۔ ۸۰ء کی دہائی تک اس تنظیم نے تشدد کی مخالفت کی اور حکومت کے مذہبی و سیاسی اختیارات کو قبول بھی کیا۔

۱۹۹۲ء میں اس تنظیم نے اپنا نام تبدیل کر کے Movement of Unity and Reform (MUR) رکھ دیا اور اسی نام سے سیاسی جماعت کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں، لیکن سرکاری حکام نے ان کی درخواست مسترد کر دی۔ تاہم جب اس تنظیم نے ۱۹۹۶ء میں ہی ایک غیر مقبول تنظیم Popular, Democratic, and Constitutional Movement (MPCD) کے ساتھ اتحاد کیا تو حکومت نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ بعد ازاں اس تنظیم کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ۳۲۵ نشستوں میں سے MPCD نے ۹ نشستیں حاصل کیں۔ ۱۹۹۸ء میں اس تنظیم نے اپنے آپ کو ''جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی'' کے نئے نام سے متعارف کروانا شروع کیا۔ PJD نے انتخابی سیاست میں اپنی توجہ مرکوز کر کے اپنی مقبولیت میں اضافہ کیا اور کوشش کی کہ MUR کو اپنے آپ سے الگ رکھا جائے جو تحریک کا دعوتی ونگ تھا۔

۲۰۰۲ء کے انتخابات میں PJD ۴۲ نشستوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر، جب کہ ۲۰۰۷ء کے انتخابات میں ۴۶ نشستیں حاصل کر کے ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت بن گئی۔ اہم بات یہ ہے کہ PJD نے کم نشستوں پر انتخابات لڑ کر شعوری طور پر یہ کوشش کی وہ ملک کے سیاسی منظر نامے پر حاوی نہ ہو۔ اپنے آپ کو ایسی جماعت کے طور متعارف کروایا جو ''نہ جیتنے'' کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہو۔ ان کی اس حکمت عملی کے نتیجے میں انھیں بتدریج نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ کا اعتماد بھی حاصل ہو گیا۔

اس حکمت عملی کے نتیجے میں بادشاہ نے ان کو اسٹیبلشمنٹ مخالف جماعتوں Al Adl wa-Ihssan (AWI) اور Justice and Spirituality کے بہترین متبادل کے طور پر قبول کر لیا۔ ۱۹۸۶ء سے AWI اور ریاست کے درمیان شدید کشمکش جاری تھی۔ یہ حزب اختلاف کی ایک مقبول ترین جماعت تھی اور یہ وہ واحد تنظیم تھی جس نے نہ صرف ریاست کے سامنے

سوالات اٹھائے بلکہ بادشاہت کو بھی للکارا۔

اس جماعت کے ارکان نے مراکش کو جمہوری ریاست بنانے کے حوالے سے بھی آواز بلند کی۔ یہ تنظیم پابندی کا شکار رہی تاہم ریاست نے اس گروہ سے سختی سے نبٹنے سے گریز کیا۔ یہ جماعت اس وقت کے مروجہ سیاسی نظام کو غیر قانونی سمجھتی تھی، اس سوچ کی وجہ سے اس گروہ نے تقریباً تمام انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ AWI کے مجموعی فیصلے PJD کے فیصلہ سازی کے عمل میں موزوں کردار ادا کرتے تھے۔ PJD نے اس تنظیم کے فیصلوں کو سامنے رکھ کر ٹکراؤ اور مفاہمت کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے سیاسی فیصلے کیے۔

النہضہ:

PJD کے ساتھ ساتھ النہضہ بھی وجود میں آئی۔ راشد الغنوشی نے ۱۹۷۲ء میں شریک بانی کے طور پر ایک جماعت کی بنیاد رکھی جو بڑی حد تک اخوان سے متاثر تھی۔ اس جماعت نے ابتدا میں تو مذہبی اور سماجی معاملات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ ۱۹۷۸ء میں جب صدر حبیب بورقیبا نے ملک میں ہونے والے احتجاج کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی تو اس وقت اپنی جدوجہد کی وجہ سے اس جماعت کا طلبہ ونگ نمایاں انداز میں سامنے آیا اور سیاست میں فعال کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اگلے ہی برس ایک خفیہ اجلاس کے ذریعے اس گروہ نے خود کو ''اسلامک ٹینڈینسی موومنٹ'' (MTI) کا نام دے دیا۔

۱۹۸۰ء میں جب پولیس نے اس تحریک کا پتا لگایا تو اس جماعت نے عوام میں جا کر حبیب بورقیبا کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جون ۱۹۸۱ء میں MTI نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے خود کو ایک سیاسی جماعت کے طور پر متعارف کروایا اور ساتھ ہی اپنی قیادت کا اعلان بھی کیا۔ اور حکومت سے درخواست کی اسے ایک سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹر کیا جائے۔ ریاست نے MTI کی درخواست مسترد کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی ساری قیادت کو جیل میں ڈال دیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد ایک دفعہ پھر حکومت نے ان کے خلاف ایک زبردست کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ حبیب بورقیبا نے راشد الغنوشی اور دوسرے راہنماؤں کو پھانسی دینے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن پھر زین العابدین نے انھیں عہدے سے فارغ کر دیا۔

بن علی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد MTI کے ساتھ ریاست کے سلوک میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔ ابتدا میں تو بن علی نے حزب اختلاف کی جماعتوں کو عام طور پر اور مذہبی تنظیموں کو راضی کرنے کے لیے خصوصی طور پر آزادی دی جیسا کہ انھوں نے MTI کو سیاسی عمل میں شامل کیا اور اسلامک ہائی کونسل میں بھی شامل کیا۔ MTI نے اس آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک کی انتخابی سیاست میں مکمل حصہ لیا۔ ۱۹۸۸ء کے اواخر میں MTI نے اپنا نام تبدیل کر کے ''حرکۃ النہضہ'' رکھ لیا۔ اور ایک دفعہ پھر سیاسی جماعت کی حیثیت سے رجسٹر ہونے کی درخواست دی، اور ۱۹۸۹ء کے انتخابات میں اپنے امیدواروں کو آزاد حیثیت سے انتخاب لڑوانے کا فیصلہ کیا۔ ان امیدواروں نے انتخابات میں ۱۴٫۵ فیصد ووٹ حاصل کیے، جو کہ حزب اختلاف کی جماعتوں میں سب سے زیادہ تھے۔ لیکن بن علی نے ان کو نشستیں دینے سے انکار کر دیا۔ یہیں سے ریاست کے ساتھ تعلقات پھر سے کشیدہ ہو گئے۔ حکومت نے النہضہ کی درخواست پھر سے مسترد کر کے اس کے خلاف دوبارہ کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ ۱۹۹۱ء میں اس وقت کشیدگی اپنے عروج پر پہنچ گئی جب النہضہ کے کارکنان نے بن علی کی پارٹی کے دفتر پر حملہ کر کے جلا دیا اور وہاں ایک شخص کو قتل بھی کر دیا گیا۔ یہ واقعہ النہضہ کے خلاف تاریخ کے بدترین کریک ڈاؤن کی وجہ بنا۔ پھر النہضہ کے بہت سے رہنماؤں نے اگلے بیس برس جیلوں میں، چھپ کر اور جلاوطنی کی صورت میں گزارے۔

عرب بہار اور ۲۰۱۱ء کے انتخابات:

۲۰۱۱ء میں جب ''عرب بہار'' کا آغاز ہوا، تو اس کی قیادت ''اسلام پسندوں'' کے ہاتھ میں نہ تھی، بلکہ اس کی قیادت وہ نوجوان طبقہ کر رہا تھا جو معاشی، معاشرتی اور سیاسی ظلم وستم کا شکار تھا۔ جب مظاہروں کا آغاز ہوا تو مذہب پسندوں نے کریک ڈاؤن کے ڈر سے بہت احتیاط سے کام لیا۔ مصر میں اخوان کے مرشد عام نے اپنے کارکنان کو ۲۵ جنوری کے احتجاج میں حصہ نہ لینے کی تاکید کی تھی۔ مراکش میں بھی یہی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ تیونس میں بھی جب بن علی کے خلاف احتجاج کا آغاز ہوا تو النہضہ اس کا حصہ نہیں تھی۔ ان تنظیموں کے بہت سے لوگوں نے احتجاج کے آغاز ہی میں حصہ تو لیا لیکن انفرادی طور پر، تاہم جب احتجاج کی لہر تیز ہو گئی تو ان کی تنظیموں نے بھی باقاعدہ احتجاج میں شمولیت اختیار کر لی۔ جب مصر اور تیونس میں حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا اور مراکش کی حکومت اصلاحات کے لیے راضی ہو گئی، تو اخوان، النہضہ اور PJD نے سیاسی عمل، یعنی انتخابات میں حصہ لے کر اپنا سیاسی وزن بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اخوان نے پہلی دفعہ باقاعدہ طور پر اپنی سیاسی پارٹی FJP کے قیام کا اعلان کیا، اور اس کی حمایت کے لیے عوامی سطح پر جا کر کام کیا۔ جس کے نتیجے میں اس سال ہونے والے انتخابات میں اخوان کو ۳۷ فیصد ووٹ ملے، یعنی وہ ۲۳۵ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اپنے اتحادی ''سلفی نور پارٹی'' جس نے ۲۸ فی صد ووٹ حاصل کیے تھے، اس کے ساتھ مل کر پارلیمان کا کنٹرول سنبھال لیا۔ مراکش میں PJD نے بھی اپنی سابقہ کامیابی کو برقرار رکھتے ہوئے ۲۳ فی صد ووٹ حاصل کیے اور ۳۹۵ میں سے ۱۰۷ نشستیں حاصل کیں۔ اور ملک کی بڑی پارٹی ہونے کا اعزاز برقرار رکھا۔ النہضہ نے National Constituent Assembly کی ۲۱۷ میں سے ۸۹ نشستیں حاصل کیں۔ اس اسمبلی کو ملک میں عام انتخابات کروانے کی ذمے داری سونپی گئی۔ دہائیوں کے ظلم و جبر کے بعد شمالی افریقا کی اسلامی تحریکوں کو اچانک حکومت سنبھالنے کا موقع مل گیا۔

اسلامی تحریکوں کی مقبولیت کا دور:

۲۰۱۱ء عرب بہار کے نتیجے میں اسلامی تحریکوں کو مصر، مراکش اور تیونس میں حکومت کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے اپنی اپنی اہلیت کے مطابق حکومتیں چلائی۔ یہ تحریکیں حکومت میں آنے کے بعد کیسے برتاؤ کریں گی، اس پر آج تک سب لوگ ابہام کا شکار تھے۔ لیکن اب ان کے اقتدار میں آنے یہ سب پہلو نمایاں ہو گئے۔ اس مقالے میں اخوان، النہضہ اور PJD کے نظریات، ان کی عوام سے کیے گئے وعدوں کی پاسداری اور خواتین کے حقوق کے بارے میں ان کے موقف کا احاطہ کیا گیا ہے۔

نظریہ:

PJD، النہضہ اور اخوان نے اپنے اپنے ممالک میں انتخابات جیتنے کے بعد نہ سخت قوانین کا اطلاق کیا اور نہ شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا اور نہ ہی اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان کیا۔ تینوں جماعتوں کے تجربات اور ان کے ممالک کے حالات نے انھیں مختلف طریقوں سے کام کرنے پر مجبور کیا، تاہم تینوں نے جمہوری روایات کے حوالے سے اپنے موقف میں لچک پیدا کی، ان کے طرز عمل سے ایسا محسوس ہوا کہ آنے والی دہائیوں میں وہ جمہوریت کو بڑی حد تک قبول کر لیں گی۔ جہاں تک اخوان اور PJD کی بات ہے تو انھوں نے یہ لچک پارلیمانی سیاست میں حصہ لینے کے ساتھ ہی پیدا کرنا شروع کی، لیکن النہضہ نے اپنی پابندیوں کے دور میں بتدریج اپنے آپ کو تیونسی معاشرے کے مطابق تبدیل کیا۔

"Islamist parties in North Africa".
("brookings.edu". July 22, 2018)

ترکی سعودی عرب تعلقات میں ایک نئی کشیدگی

Birol Baskan

ترکی اور سعودی عرب کے درمیان ایک نیا بحران جنم لے رہا ہے، اور شاید یہ تنازع ماضی میں ہونے والے سعودی صحافی جمال خاشقجی کے قتل سے بھی زیادہ سخت اور نقصان دہ ثابت ہو۔ ترکی People's protection unit (YPG) کو کردستان ورکر پارٹی (PKK) کی ایک شامی شاخ سمجھتا ہے، جو ان کی نظر میں ایک دہشت گرد گروہ اور ان کے امن کے لیے خطرہ ہے اور یہی بحران کی وجہ ہے۔ ترکی کا بنیادی مقصد اب YPG کی موجودگی کا شمالی شام سے مکمل طور پر خاتمہ کرنا ہے، اسی سلسلے میں ترکی اب تک دو بڑے فوجی حملے بھی کر چکا ہے اور اب تیسرے کی تیاری کر رہا ہے۔ مگر سعودی عرب اسی YPG کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط کر رہا ہے، اور اس کی اس کوشش میں اس کے اتحادی متحدہ عرب امارات اور مصر بھی شامل ہیں۔

ترکی اور سعودیہ کے تعلقات پہلے کی طرح بہتر ہو سکتے ہیں، جیسے کہ ۲۰۰۰ء میں تھے۔ ۲۰۱۰ء میں سلطنت کی طرف سے اُس وقت کے وزیر اعظم طیب اردوان کو اسلام کی خدمت کرنے پر ملک کے سب سے بڑے اعزاز ''شاہ فیصل ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ مگر جب عرب میں حکومت مخالف مظاہروں کا آغاز ہوا تو دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو آہستہ آہستہ اور منظم طریقے سے خراب کیا گیا۔ ترکی نے پوری صورتحال کا پُرجوش طریقے سے مقابلہ کیا اور اپنی کوششوں کے ذریعے مصر کے ساتھ تعلقات کو بہتر کیا، جس کے صدر اخوان المسلمون کے محمد مرسی تھے مگر سعودیہ نے اُس وقت احتیاط سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ سعودی حکمرانوں کو یہ ڈر تھا کہ عرب میں ہونے والی بغاوت کہیں اسلام پسندوں اور دیگر اپوزیشن گروہوں کو مزید مضبوط نہ کر دے، اور وہ اس لیے بھی فکرمند تھے کہ اخوان المسلمون کی مبینہ ایران ہمدردیاں کہیں سلطنت میں توازن کو قائم کرنے کی کوشش کو کمزور نہ کر دیں۔

سعودی عرب نے ترکی کے ساتھ اپنے تعلقات کسی نہ کسی طرح قائم رکھے بلکہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شام کی دلدل میں بھی کودنے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ شام میں بشار الاسد کی حکومت کو ختم کیا جا سکے۔ جبکہ ۲۰۱۳ء میں مصر میں ہونے والی فوجی بغاوت پر دونوں ممالک کا موقف بالکل مختلف ہے، مگر اس کے باوجود دونوں ملکوں نے شام میں تعاون جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ اپریل ۲۰۱۵ء میں دونوں کی مدد سے ''جیش الفتح'' کا قیام عمل میں آیا، جو کہ سنی اسلام پسند باغی گروہوں کا اتحاد تھا، جس نے آنے والے مہینوں میں حکومت کے خلاف شمالی اور جنوبی حصے میں اہم کامیابیاں حاصل کی۔

جیش الفتح کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے، روس نے ستمبر ۲۰۱۵ء میں شام میں براہِ راست فوجی مداخلت کا آغاز کر دیا۔ جس نے حتمی طور پر طاقت کا توازن حکومت کی طرف منتقل کر دیا۔ شام میں روس کی مداخلت نے جغرافیائی سیاست اور منظر نامے کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا، کیوں کہ اب سعودی عرب کی دلچسپی اسد حکومت کو ختم کرنے میں نہیں رہی اور ترکی کی توجہ شمالی شام میں YPG کی بڑھتی ہوئی تعداد پر مرکوز ہے۔

ترکی سعودی عرب تعلقات میں سب سے نازک مرحلہ جون ۲۰۱۷ء میں آیا، جب سعودیہ اور اُس کے ساتھ مصر، بحرین اور متحدہ عرب امارات نے قطر کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر دیے اور کافی سخت اقدامات کیے گئے اور مکمل طور پر ناکہ بندی کر دی گئی۔ اس بحران کے دوران ترکی نے مکمل طور پر قطر کا ساتھ دیا، کھانے پینے کا سامان بھیجا گیا تاکہ کسی قسم کی غذائی قلت نہ ہو اور سب سے اہم یہ کہ اپنی افواج کو قطر میں تعینات کر دیا گیا۔ ترکی کا قطر نواز موقف سعودی عرب اور اُس کے اتحادیوں کے لیے پریشانی کا باعث بن رہا تھا۔ اسی لیے اس بحران کو ختم کرنے کے لیے کیے گئے مطالبے میں ترک فوج کی چوکیوں کے خاتمے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

سعودی عرب نے بہت جلد اپنا ردِعمل ظاہر کر دیا۔ بحران شروع ہونے کے پانچ دن بعد ہی ترکی کے ایک حکومت نواز اخبار Yeni Safak نے اطلاع دی کہ سعودی عرب، مصر اور متحدہ عرب امارات نے YPG کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کی ہے۔ اخبار میں شائع ہونے والی تصویر سے پتا چلتا ہے کہ یہ ملاقات ایک دفتر میں ہوئی جہاں پر عبداللہ اوکلان کی تصویر دیوار پر موجود تھی جو کہ کردستان ورکرز پارٹی (PKK) کے بانی ہیں اور اس وقت ترکی کی ایک جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

آنے والے مہینوں میں بات مزید آگے بڑھی۔ جیسے کہ اکتوبر ۲۰۱۷ء میں، سعودی وزیر برائے خلیجی امور Thamer al-Sabhan نے YPG کی نگرانی میں Brett McGurk کے ساتھ Raqqa شہر کا دورہ کیا، جو کہ اُس وقت امریکا کی طرف سے داعش کے خلاف ہونے والے اتحاد کے خصوصی نائب بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ شہر کی تعمیر نو کے حوالے سے بات چیت ہو سکے۔ ایک سال سے کم عرصے کے دوران ہی، اگست ۲۰۱۸ء میں سعودی عرب نے اُن علاقوں کی تعمیراتی منصوبوں کے لیے سو ملین ڈالر دینے کا وعدہ کیا جو کہ پہلے داعش کے قبضے میں تھے مگر اب YPG کی نگرانی میں ہیں، اور اکتوبر ۲۰۱۸ تک مکمل ادائیگی کر دی گئی۔

مالی اور اقتصادی تعلقات کے علاوہ، سعودی عرب اور اس کے اتحادی YPG کے ساتھ عسکری معاونت کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ اس وقت ترک ذرائع ابلاغ پر اس قسم کی کافی اطلاعات گردش کر رہی ہیں کہ سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں کے فوجی حکام اور YPG کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ان ملاقاتوں کے کیا نتائج نکلتے ہیں یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔ لیکن ترکی اور اس کا ذرائع ابلاغ تمام صورتحال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ جس کے نتیجے میں اس وقت ترکی میں سعودی عرب مخالف جذبات شدت اختیار کر گئے ہیں اور شاید مستقبل قریب میں اس میں مزید اضافہ ہو۔ اور اب یہ کوئی حیرت کی بات نہیں رہی کہ حکومت نواز کالم نگار سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کو واضح طور پر ترکی کا دشمن قرار دے رہے ہیں۔

یقیناً ۲۰۱۸ء ترکی اور سعودی عرب تعلقات کے لیے ایک مشکل سال تھا، مگر شاید ۲۰۱۹ء مزید بدتر ہو۔ اگر ابھی کوئی سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے تو موجودہ صورتحال یہ بات ظاہر کر رہی ہے کہ دوطرفہ بحران میں مزید اضافہ ہوگا۔

(ترجمہ: عبدالرحیم کامران)

"A new Turkey-Saudi crisis is brewing".
("mei.edu". January 8, 2019)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کا شائع کردہ جدید ایڈیشن

حدیثِ نبویؐ اور سائنسی علوم

مولانا عبدالحق ہاشمی

قیمت: ۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950